ماہنامہ **میثاق** لاہور

جلد ۳	بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۳۸۰ھ	عدد ۶

تذکرہ وتبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ——— " ——— ۹

اجتماعیات وسیاسیات

اسلام کا شورائی نظام ——— مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری ——— ۱۷

مقالات

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب ——— مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی ——— ۳۳

سفر حج

کراچی سے جدہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۴۴

مراسلہ و مذاکرہ

— اسلامی اخبارات میں عریاں تصاویر کی اشاعت
— موجودہ حالات میں علماء کی بے حسی
} — امین احسن اصلاحی ——— ۵۳

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ

مینیجر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کی پچھلی دو اشاعتوں میں ہم نے انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ اصلاح اور اہلِ سیاست کے طریقۂ کار کے فرق کو مختصر طور پر واضح کر دیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ دینی احساس رکھنے والے بہت سے اربابِ فکر کو ہمارے خیالات نے متاثر کیا اور انھوں نے خطوط لکھ کر ہمارے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ انھوں نے بڑی صفائی اور نہایت ہی قابلِ قدر اخلاقی جرأت کے ساتھ اس بات کا اقرار کیا ہے کہ کام کرنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، خواہ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے۔ ہم ان مخلصین کی اس اخلاقی جرأت کی تحسین کرتے ہیں کیونکہ ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کل تک ایک خاص طریقہ پر کام کرتے رہے ہیں اور اس طریقہ سے کسی اختلاف کو برداشت کرنے کے لیے وہ کسی حال میں تیار نہ تھے۔ لیکن اب چونکہ ایک واضح چیز نہایت واضح دلائل کے ساتھ ان کے سامنے آگئی ہے اور حالات و واقعات نے بھی اس کی تائید کر دی ہے اس وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی سے بالاتر ہو کر انھوں نے اس سچائی کو تسلیم کر لیا ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کے اس دور میں یہ حق پسندی اور یہ اخلاقی جرأت ہمارے نزدیک بڑی قابلِ قدر ہے۔ ہم ان دوستوں کو مبارک باد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کے نقشِ قدم کی پیروی کی توفیق ہو وکثّر اللّٰہ امثالھم

ان دوستوں میں سے بعض نے ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ لگے ہاتھوں ہمیں یہ بھی بتانا چاہیے کہ اس

نصب العین کے لیے جس کی طرف ہم نے اپنے پچھلے مضامین میں اشارہ کیا ہے اس وقت کیا کام کیے جا سکتے ہیں اور کس طرح کیے جا سکتے ہیں۔ اور بعض نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ جب ہم نے اس راہ کی دعوت دی ہے تو یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ ہم آگے بڑھ کر لوگوں کی رہنمائی بھی کریں تاکہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اس مقصد کی خدمت کے لیے بیدار ہو چکی ہیں وہ کام میں لگ جائیں اور تعطل یا بے راہ روی میں مبتلا ہو کر وہ ضائع نہ ہو جائیں۔

ان میں سے جہاں تک دوسرے مطالبہ کا تعلق ہے اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ مشہور مثل تو یہی ہے کہ "جو بولے وہی کنڈا کھولے" لیکن حقیقت میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کی موجودگی میں یہ بات تو بڑی آسان ہے کہ کوئی شخص آپ کی کسی غلط بات پر آپ کو متنبہ کر دے یا آپ کو صحیح سمتِ سفر کی طرف اشارہ کر دے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس راہ میں آپ کا سالارِ قافلہ بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ کسی بات کا بتا دینا اور چیز ہے اور اس کو کر کے دکھا دینا یا اس راہ میں دوسروں کی قیادت کے لیے موزوں ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کے لیے پہلی چیز سے بالکل مختلف شرائط مطلوب ہیں، جن پر خدا نے چاہا تو ہم آئندہ کسی صحبت میں گفتگو کریں گے۔ ہماری قوم نے مردم شناسی کے معاملہ میں بدقسمتی سے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ جس کسی نے بھی چلنے میں ذرا تیز روی دکھا دی ہے، ہم اس کو اپنی سادگی سے اپنا رہنما بنا بیٹھے ہیں۔ اس چیز کے سبب سے ایک عرصہ دراز سے ہماری ساری قوتِ کار سرزہ گردی کی نذر ہو رہی ہے۔ بیماری کے دعظ کو بردہ کر دینے والا مسیح نہیں ہوتا۔ حضرت عیسیٰؑ کی یہ نصیحت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ "میرے بعد کتنے آئیں گے جو میری باتیں تم سے میرے ہی نام سے کہیں گے لیکن ان سے ہوشیار رہنا، ان میں اکثر بٹمار ہوں گے۔"

رہا پہلا مطالبہ تو اس کا جواب اگرچہ ان صفحات میں ہم اس سے پہلے بھی دے چکے ہیں لیکن ممکن ہے وہ باتیں بہت سے قارئین کے حافظہ سے نکل گئی ہوں اس لیے ہم اجمال کے ساتھ ان کو پھر بیان کیے دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی زندگی کے احیاء کے لیے کام کرنے والوں کو اہلِ سیاست کے طریقوں سے کلیتہً پرہیز کرنا چاہیے۔ انھیں حصولِ اقتدار کی خواہش، ووٹ حاصل کرنے کی غرض اور سیاسی جوڑ توڑ کے ہر شائبہ سے پاک اور بالاتر ہو کر عوام کے پاس صرف ان کی خدمت اور ان کی مذہبی

و اخلاقی اصلاح کے لیے جانا چاہیے۔ جو برائیاں اس وقت معاشرے میں عام ہو رہی ہیں ان کے دنیوی اور اخروی نقصانات دل سوزی و ہمدردی کے ساتھ انھیں بتانے چاہئیں۔ جن فضول قسم کے مذہبی مناقشات میں اس وقت ہمارا دینی طبقہ الجھا ہوا ہے علماء اور عوام دونوں کو ان کے مضر نتائج سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اور یہ کام ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو خود دینی رنگ میں گہرے طور پر رنگے ہوئے ہوں۔ اسلام کا نام محض ان کی زبانوں ہی پر نہ ہو بلکہ ان کے دلوں میں بھی اترا ہوا ہو۔ اور جو صرف لٹریچر اور پروپیگنڈے ہی کو حصول مقصود کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اپنے عمل اور اپنے کردار سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس وقت جدید فکر و فلسفہ کی بدولت اسلام کے خلاف خود مسلمانوں ہی کے ایک طبقہ کے اندر جو ذہنی اور عملی بغاوت پھیل رہی ہے اس کو روکنے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہیے۔ اس کو روکنے کے لیے، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، کوئی ہنگامی اور وقتی تدبیر کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک سے زیادہ ایسے علمی و تحقیقی اداروں کی ضرورت ہے جو اسلام کی خدمت کے لیے ذہین اور صالح الفطرت نوجوانوں کی تربیت بھی کریں اور جو ان تمام مسائل پر بلند پایہ علمی اور تحقیقی لٹریچر بھی تیار کریں جو مغربی فکر و فلسفہ کی فتنہ انگیزیوں سے اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جن سے ہمارا پورا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس وقت بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اب ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہمارے موجودہ مذہبی طبقہ کے اندر اس فتنہ کے مقابلہ کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کام کے لیے ایسے رجال فکر تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کی حمایت و مدافعت کے لیے جدید اسلحہ سے مسلح ہوں۔ اگر اس قسم کے اشخاص پیدا کرنے کا جلدی سے جلدی کوئی انتظام نہ ہوا تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس ملک میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ یہ بات اگرچہ نہایت ہی دردانگیز ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے اس وجہ سے ہمیں کہنی پڑی ہے اور خاص طور پر اس وجہ سے کہنی پڑی ہے کہ جس چیز پر اس ملک میں اسلام کا انحصار ہے اس کے لیے کوئی عملی اقدام تو درکنار اب تک اس کا کوئی احساس بھی ہماری قوم کے اندر نہیں پایا جاتا۔

اس چیز کے مفید تر بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ کام ایسے لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے جن پر کسی خاص پارٹی یا جماعت کا لیبل لگا ہوا نہ ہو تاکہ ہماری قوم کا ہر طبقہ بغیر کسی شک اور بدگمانی کے اس سے فائدہ

اٹھا سکے۔ بسا اوقات ہم نے دیکھا ہے کہ نہایت اعلیٰ مذہبی اور علمی خدمات محض اس وجہ سے مشکوک اور بدگمانیوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور لوگوں کے اندر ان کے خلاف تعصبات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان خدمات کے انجام دینے والوں پر کسی خاص پارٹی یا جماعت کا لیبل لگا ہوا ہوتا ہے۔ بعض حالات میں اس بدگمانی کے لیے نہایت معقول اسباب بھی ہوتے ہیں۔ تجربہ گواہ ہے کہ پارٹیوں اور جماعتوں کے ساتھ وابستہ ہو جانے کے بعد آدمی کے طرز فکر پر پارٹی اور جماعت کے مخصوص رجحانات کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ اس کے سوچنے کا انداز علمی کے بجائے بالکل سیاسی ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے فکر کا کتنا حصہ بے آمیز اور خالص ہے اور کتنا اس کے اپنے جماعتی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جماعتی عصبیت کے مریضوں نے حقائق کو مسخ کرنے اور ہر چیز کو (یہاں تک کہ اللہ و رسول کو بھی) اپنے رنگ میں دکھانے کی ایسی مکروہ کوششیں کی ہیں کہ ان کے کسی کام کو بھی جنبہ داری سے بالاتر سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ فکر دینے والا گروہ اگر ہر قسم کی سیاسی تنظیمات سے بالکل الگ تھلگ رہے گا تو اس فکر سے اجتماعی زندگی متاثر کس طرح ہو گی اور اس سے کوئی انقلاب کس طرح رونما ہو گا؟ یہ شبہ جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ دنیا کے انقلابات کی تاریخ اور ان کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو اشخاص فکر دیں وہی انقلاب کا چکر بھی گھمائیں۔ ایک صحت مند اور طاقتور فکر خود اپنے حامی اور علمبردار پیدا کر لیتی ہے اور وقت آنے پر اس کے لیے کام کرنے اور اس کو عملاً برپا کر دینے والے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ روح انسانی آج جس چیز کے لیے بے چین ہے آپ اس کے مہیا کرنے کا سامان کیجیے۔ اس میں اگر زندگی ہو گی تو وہ قبرستانوں کے مردوں کو بھی اپنی حمایت میں اٹھا کھڑا کرے گی۔

تیسری چیز اس سلسلہ کی یہ ہے کہ حکومت کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے صرف کشمکش اور زور آزمائی ہی کا ایک طریقہ دنیا میں نہیں ہے کہ اگر آج اس کا کوئی موقع باقی نہیں رہ گیا ہے تو اسلام کی خدمت کے علمبردار دین و دنیا ہر چیز سے روٹھ کے بیٹھ رہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج نعرے لگانے، دھواں دھار تقریریں کرنے، دھونس جمانے، ہیکڑی دکھانے کے مواقع باقی نہیں رہے لیکن تعاون، اخلاص اور ہمدردی

و خیر خواہی کے ساتھ حکومت سے بات کرنے، اس کو مشورہ دینے اور خرابیوں کی اصلاح کا مطالبہ کرنے کی راہ آج بھی کھلی ہوئی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اگر ہمارے علماء اور دوسرے ارباب کار اپنی پچھلی روش چھوڑ کر یہ راہ اختیار کرلیں تو اسلام کے حق میں اس کے نتائج نہایت بہتر نکلیں گے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آرہی ہے کہ آخر یہ راہ کیوں نہیں اختیار کی جارہی ہے۔ کیا برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام ملک میں قائم نہ ہو تو علماء پر سے تمام مذہبی ذمہ داریاں ساقط ہوجاتی ہیں؟

ملک کے حالات پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ آج ہر چیز نہایت تیزی سے بدل رہی ہے۔ معاشرے کی اخلاق و مذہبی حالت روز بروز گرتی جارہی ہے، ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر مغربی رنگ چھائے جارہا ہے۔ تعلیم میں، تمدن میں، معاشرت میں، معیشت میں مذہب کا عنصر کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ یہ ساری چیزیں قابل توجہ ہیں۔ اس دور میں اگر توجہ کی جائے جب کہ ہر چیز ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ان کی تشکیل میں کچھ حصہ اہل دین کا بھی شامل ہوجائے گا لیکن جب ہر چیز ڈھل ڈھلا کر ایک خاص صورت قبول کرچکے گی اور ایک مخصوص ہیئت پر وہ پختہ ہوجائے گی، تو اس وقت آپ کا متوجہ ہونا بالکل بعد از وقت ہوگا۔ آج تو یہ ممکن ہے کہ ایک بات ہمدردانہ مشورہ دینے ہی سے درست ہوجائے لیکن کل جب کہ وہ پختہ ہوجائے گی تو سر دے کر بھی شاید آپ اس کو درست کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

جو لوگ سیاسی کھلاڑیوں کے سے کھیل کھیلنے کے عادی رہے ہیں اور جنھوں نے ہمیشہ محاذ بنانے اور انقلاب برپا کردینے کی دھمکی کے بدون کوئی بات کرنا اپنی کسر شان سمجھا ہے ان کے نفس پر اس راہ کو اختیار کرنا بڑا شاق گذرے گا لیکن اگر وہ اس ملک میں اسلام کی کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ اپنے مزاج اور طریقہ کار میں تبدیلی کریں۔ یہ تبدیلی انھیں انبیاء کے طریقہ کار سے قریب بھی کرے گی اور اگر حکمت عملی کا دین میں کوئی مقام ہے تو اس کا تقاضا بھی اسی طرح پورا ہوگا ورنہ یہ تعطل جو اس وقت پیدا ہوگیا ہے کبھی بھی دور نہ ہوگا اور ایک غلط قسم کی خودداری کے پیچھے دنیا اور آخرت دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

اس مقصد کے لیے وسائل و ذرائع کا بھی سوال ہے اور ساتھ ہی اشخاص و رجال کا بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیش نظر کام کے لیے نہ تو موزوں آدمی ہی نظر آتے ہیں اور نہ ضرورت کے مطابق سرمایہ ہی حاصل ہونے کی موجودہ حالات میں کوئی امید بندھتی ہے۔ اس مشکل کے حل ہونے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے، وہ یہ کہ جو لوگ اس مقصد کی اہمیت کو سمجھ چکے ہیں وہ باہم مل کر یک جہتی کے ساتھ کوئی جامع پروگرام بنائیں اور اپنی طاقتیں اور اپنے وسائل الگ الگ نشانوں پر ضائع کرنے کے بجائے ایک ہی نشانہ اور ایک ہی مرکز پر صرف کریں۔ اس ملک میں ایسے اصحاب وسائل موجود ہیں جو اس مقصد کے لیے روپیہ صرف کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح ایسے اشخاص بھی ہیں جو اس نصب العین کے لیے اپنی قابلیتیں اور صلاحیتیں وقف کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ان کی راہ میں جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب اپنے اپنے مقامی بندھنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس پابندی کے سبب سے ان سب کا باہمدگر جڑنا دشوار ہورہا ہے اور آپس میں جڑے بغیر ان کا کوئی ایسی موثر طاقت بننا محال ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مفید اور قابل ذکر خدمت انجام پاسکے۔

اگر یہی صورت حال قائم رہے تو یہ اسلام کے جتنے بھی دردمند ہیں سب اپنے اخلاص اور اپنی دردمندی کے باوجود اپنی اپنی جگہوں پر یا تو ٹھنڈی آہیں بھرتے رہیں گے یا اپنے مال اور اپنی صلاحیتیں نہایت ہی حقیر کاموں پر ضائع کرتے رہیں گے جس سے اسلام کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ اگر یہ حضرات فی الواقع اس دور غربت میں اسلام کی کوئی مفید خدمت انجام دینا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ یہ سب لوگ اپنے مقامی علائق سے اپنے اپنے ذہنوں کو آزاد کرکے اس بات پر آمادہ ہوجائیں کہ باہمی مشورہ سے اسلام کی خدمت کے لیے اس وقت جو کام جس جگہ کرنا طے پا جائے گا اپنے اپنے وسائل اور اپنی اپنی صلاحیتیں ﷲ و فی اللہ سب اس کی نذر کردیں گے۔ اگر یہ شکل بن جائے تو ہم توقع رکھتے ہیں کہ معاشرہ کی اخلاقی و مذہبی اصلاح کا ایک نظام بھی قائم ہوسکتا ہے، وسیع پیمانہ پر ذی صلاحیت نوجوانوں کی تربیت کا ادارہ بھی قائم ہوسکتا ہے اور فکری اصلاح کے لیے تحقیقات اور ریسرچ کے کام بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

ہم اس موقع پر تمام دینی حس رکھنے والے مسلمانوں اور خاص طور پر علمائے کرام سے اپیل کرتے ہیں،

کہ وہ حالات کی نزاکت اور عنداللہ اپنی ذمہ داریوں پر غور کریں اور تمام بیجا قسم کی خود داریوں اور گروہی تعصبات و معاندات سے بالاتر ہو کر اسلام کے بقا و تحفظ کی راہیں سوچیں۔ اس وقت ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا موقع بلاشبہ باقی نہیں ہے لیکن دین حق کی دعوت اور اس کی شہادت کی راہ نہ تو بند ہوئی ہے اور نہ کبھی بند ہو سکتی ہے بلکہ ہم اگر یہ کہیں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ موجودہ حالات میں دین کی خدمت کے پہلے سے زیادہ امکانات پیدا ہو گئے ہیں بشرطیکہ کام کرنے والے انبیاء کے طریقہ پر صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کام کریں، سیاسی طرز کی جوڑ توڑ بازیوں سے پرہیز کریں، حکومت کے ذمہ داروں اور ملک کے عوام دونوں کے سامنے یکساں دل سوزی و ہمدردی کے ساتھ اللہ کے دین کو اس کی تمام حجتوں کے ساتھ پیش کریں اور اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ قوم کی اصلاح اور آخرت کی کامیابی کے سوا اپنی ان خدمتوں کا کسی سے بھی کوئی اجر یا صلہ نہیں چاہتے۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے یہاں سے طلب فرمائیں

مفردات القرآن (قرآن کے مشکل الفاظ کی تحقیق) (عربی) ایک روپیہ چار آنے

اسباق النحو حصہ اول (عربی گرامر جدید طریق پر) (اردو) ایک روپیہ

اسباق النحو حصہ دوم " (") بارہ آنے

تحفۃ الاعراب (منظوم) " (") چار آنے

امثال آصف الحکیم (عربی ادب سیکھنے کی ابتدائی کتاب) (عربی) ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور

نوٹ:۔ کتابیں بذریعہ وی پی طلب کریں یا ان کی قیمت مع محصول ڈاک پیشگی بھیج کر طلب فرمائیں (محصول ڈاک ۔/۔)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۃ البقرہ

(۱۷)

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ ... مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا	بقل کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کے تمام اقسام کے لیے عام ہے۔

قثاء کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔

فوم اور ثوم ایک ہی چیز ہے اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ اہل عرب ث کو کبھی کبھی ف سے بدل دیا کرتے ہیں مثلاً جاثور کو جافور اور اثافی کو اثاثی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں فوم کا لفظ بھی لہسن ہی کے لیے چلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لہسن کے لیے یہ لفظ اس قدر مشہور ہے کہ اس سے روٹی یا گندم یا غلہ وغیرہ مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تاویل ہمیشہ الفاظ کے مشہور معانی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس مطالبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا ذکر تورات کی کتاب گنتی کے باب ۱۱ میں اس طرح ہے

"اور جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں اور من کے سوا ہم کو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" (۴-۶)

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ۔ ادنیٰ دنائت سے ہے، یعنی کیا تم ایک اعلیٰ غذا کو ایک ادنیٰ اور گھٹیا غذا سے بدلنا چاہتے۔ من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے تمہارے پروردگار

نے مہیا فرمائی ہے، اور تمہیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک و کفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو، روکھی پھیکی غذا جو آزادی کے ساتھ نصیب ہو رہی ہے، غلامی اور ذلت کے حلوے سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے ایسے رسیا ہو کر ان کے پیچھے تمہاری نگاہوں میں اس آزادی کی بھی جس میں خدا کے سوا تمہارے اوپر کسی کی حکومت باقی نہیں رہی ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اس رویہ میں ان مسلمان قوموں کے لیے ایک بہت بڑا درس عبرت ہے جنھوں نے تمدن کے لوازم و تنوعات کے پیچھے اپنی آزادی کی نعمت خطرے میں ڈال دی اور اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اس طرح جو لذائذ دنیا انھوں نے حاصل کیے ہیں ان کے ساتھ ذلت کے کیسے کیسے گھناؤنے مفاسد چپکے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید کے اس مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کھانے کی لذات دسترخوان کے تنوعات کے اندر نہیں ڈھونڈھتا بلکہ ضمیر اور ارادہ کی آزادی کے اندر ڈھونڈتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو تو خشک روٹی بھی اس کے لیے ہفت الوان نعمت فراہم کر دیتی ہے۔

اھبطوا مصرا | ھبط کے اصل معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے ھبطنا الوادی (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں سے اھبطوا مصرا کا محاورہ رائج ہوا اور ھبوط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔ اس خاص موقع پر اس لفظ میں یہ موزونیت بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے جن چیزوں کا مطالبہ کیا تھا وہ کسی سواد شہر اور زرخیز علاقہ ہی میں مل سکتی تھیں۔

مصرا سے مراد کوئی شہر ہے۔ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہو سکتا۔ مصر ملک مصر کے لیے قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ غیر منصرف آیا ہے۔ صرف اس آیت میں یہ منصرف کی صورت میں آیا ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ شہر کے عام مفہوم میں آیا ہے۔ البتہ شہر کے لیے خاص طور پر یہاں مصر کے لفظ کے استعمال میں بلاغت کا یہ پہلو ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ سے ان کو وہ ذلتیں اور مصیبتیں یاد دلائی گئی ہوں جن میں وہ مصر میں مبتلا رہ چکے تھے اور مقصود اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر تم ان چٹخاروں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے تو ان کے لیے کسی مصر ہی کے شکنجہ میں اپنی گردن دینی پڑے گی۔ اس لیے کہ جو قوم کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنے اندر

صبر و استقامت نہیں پیدا کر سکتی وہ اپنے آپ کو ذلت سے نہیں بچا سکتی۔

وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ | مسکنت کے معنی پست ہمتی اور بدحالی کے ہیں۔ ان کے اوپر ذلت اور پست ہمتی مار دی گئی کی تعبیر اس حقیقت کی ہے کہ جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان کی مسلسل ناشکریوں اور آیات الٰہی کی تکذیب کے سبب سے ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں کے نرم چارہ ہی بن کر رہ گئے، حالات و خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی عزم و حوصلہ نہیں رہا۔ وباؤ بغضب من اللہ (اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے) کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے جو مواقع اس لیے فراہم کیے کہ وہ ان سے سرخروئی اور فائز المرامی حاصل کریں اپنی بدعملیوں کے سبب سے وہ وہاں سے خدا کی لعنت اور پھٹکار لے کر لوٹے۔

ذالک بانھم ..... ذالک بما عصوا وکانوا یعتدون | یہ ان کے اوپر ذلت اور غضب کے تھوپے جانے کی علت بیان ہوئی ہے کہ یہ ان کے کسی ایک گناہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کی پوری تاریخ نافرمانیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ اپنی سرکشی اور تعدی کی فطرت کے سبب سے برابر اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور اس کے نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا یہ زعم کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے اور محبوب ہیں ان کے اس مقام سے لگا نہیں کھا سکتا، ایک بالکل بے بنیاد گھمنڈ ہے۔ یہ تو اپنی کرتوتوں کے سبب سے راندے ہوئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں سے جن کا یہود کے ہاتھوں قتل ہونا خود یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے پہلا نام تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جن کو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے عین ہیکل میں قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ملتا ہے جن کو یہودیہ کے فرمان روا ہیرودیس کے حکم سے قتل کیا گیا اور ان کا سر بادشاہ نے ایک تھال میں رکھ کر اپنی معشوقہ کو نذر کیا۔

پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کا نام آتا ہے جن کو یہود نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر لٹکا دیا، اگرچہ اللہ نے آنحضرت کو ان لوگوں کے شر سے بچا لیا۔

یہاں انبیاء علیہم السلام کے قتل کے ذکر کے ساتھ بغیر الحق (ناحق) کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔

مقصود ان کے اس جرم کی سنگینی کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے کہ قتل نفس بجائے خود انسانی معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ جرم مزید سنگین ہو جاتا ہے اگر اس کا ارتکاب انبیاء و مصلحین کے خلاف کیا جائے پھر اس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب بغیر کسی وجہ جواز کے کیا جائے۔ یہاں قرآن نے یہود کے اس جرم میں تمام سنگینیاں جمع کر دی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ | ہاد، یہود، ہود کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے،

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۱۵۶ اعراف (اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا) پھر ہاد اور تہود یہودی ہونے کے معنی میں استعمال ہوئے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے، جس طرح تنصر نصرانی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل حقیقت یہی ہے لیکن بعض مخالفین اسلام نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قرآن نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہود کا لفظ ہود کے مادہ سے نہیں ہے بلکہ یہ یہوذا کی طرف نسبت ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے تھے۔ اس اعتراض کے سبب سے اس لفظ کی تحقیق ضروری ہے۔ مولانا فراہی رحؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس لفظ کی جو تحقیق بیان کی ہے۔ ہم اس کے ضروری حصہ کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ مولانا اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہم یہاں اس لفظ کے اشتقاق پر گفتگو کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا ہے انھوں نے نہ تو قرآن مجید ہی کو سمجھا ہے اور نہ خود اپنے صحیفوں ہی کو سمجھا ہے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ جو استعمال کیا ہے تو اپنی طرف سے ایجاد کر کے نہیں کیا ہے بلکہ عربی زبان کے ایک عام استعمال کردہ لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اہل عرب ہاد یہود کا فعل یہودی ہونے کے معنی میں استعمال کرتے آئے ہیں اور قرآن مجید نے هُدْنَا کا لفظ جو استعمال کیا ہے تو لفظ یہود کا اشتقاق بیان کرنے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ یہ لفظ اپنے اصل معنی یعنی توبہ کرنے اور رجوع کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خاص اس لفظ کے استعمال میں بلاغت کا ایک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ یہود کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے جس کو وہ بالکل

فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔"

"اس اعتراض سے انھوں نے خود اپنے صحیفوں سے جس بے خبری کا ثبوت دیا
اس تفصیل سے واضح ہوگی جو ہم آگے پیش کر رہے ہیں۔"

"یہوذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے اُن بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے
بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا ہے۔ یشوع کے زمانہ میں مفتوحہ علاقہ
درمیان تقسیم ہوا اور اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی
میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے۔ اُن کے زمانہ میں تمام سلط
ان کے قبضہ میں آگئی جس سے اس خاندان کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگ گئے۔
کے وارث اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنھوں نے اپنے
میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہوذا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔"

"حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات برپا ہوئے اور یہ پوری قو
بٹ گئی۔ ایک حصہ یہوذا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا بنی اسرائیل کے۔ بقیہ خا
نام اس کے بعد بالکل غیر معروف ہو کے رہ گئے۔ بعد کی تاریخ میں یہوذا اور اس
آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے ہیں تو تمام بنی اسرائیل
لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
اور یہود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔"

"لفظ یہوذا کے اشتقاق میں یہود کو بڑا اشتباہ پیش آیا ہے۔ ان کا خیال ہے
اور ذا سے مرکب ہے۔ یہو کے معنی اللہ کے اور ذا کے معنی حمد کے ہیں۔ چونکہ
کے ساتھ ترکیب پائے ہوئے نام ان کے ہاں موجود ہیں اس وجہ سے ان کو یہ
آئی اور یہوذا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کتاب پیدائش میں جو عبارت موجود ہے اس
سکے۔ سفر تکوین کی عبارت یہ ہے۔

اور وہ (لیہ زوجہ یعقوب علیہ السلام) پھر حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ تب اس
اب خداوند کی ستائش کروں گی۔ اس لیے اس کا نام یہوذا رکھا (پیدائش باب ۵

اس سے یہود نے یہ سمجھا کہ یہ لفظ اس واقعہ اور یہو کے لفظ کی طرف اشارہ کر رہا ہے حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی حمد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ الفاظ اس تاویل کے محتمل ہیں، اور مندرجہ ذیل امور اس کی تائید میں ہیں :-

ایک یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے ناموں کے معانی کی طرف جس طرح انکی ولادت کے ذکر کے سلسلہ میں اشارہ ہوا ہے اسی طرح اس موقع پر بھی اشارہ ہوا ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ مثلاً ولادت کے بیان کے سلسلہ میں کتاب پیدائش باب ۳۰۔ ۱۹۔ ۲۰ میں ہے۔

اور لیاہ پھر حاملہ ہوئی اور یعقوب سے اس کے چھٹا بیٹا ہوا۔ تب لیاہ نے کہا کہ خدا نے مجھے اچھا مہر بخشا۔ اب میرا شوہر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ میرے اس سے چھ بیٹے ہو چکے ہیں۔ سو اس نے اس کا نام زبولون رکھا۔

پھر اسی کتاب میں دعائے برکت کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

زبولون سمندر کے کنارے بسے گا ۴۹/۱۳

غور کر کے دیکھو، ان دونوں مواقع پر سکونت کے معنی کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح یہوداہ کے متعلق اس کتاب میں جو دعا مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

اے یہوداہ! تیرے بھائی تیری مدح کریں گے۔

تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں کی گردن پر ہوگا۔

تیرے باپ کی اولاد تیرے آگے سرنگوں ہوگی ۴۹/۸

اس سے واضح ہوا کہ یہوداہ کے تسمیہ میں درحقیقت حمد و طاعت کا مفہوم ملحوظ ہے۔ اور لفظ یہوذا یہو اور ذا سے مرکب نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی لفظ ہے اور اس کا مادہ ہود ہے۔

دوسرا یہ کہ کلدانیوں کی اسیری کے بعد سے ان کے لیے مشترک طور پر جو نام استعمال ہوا ہے وہ یہود اور یہودی کا ہے۔ اس کے ثبوت عزرا، نحمیا، استیر، اشعیا، ارمیاہ، دانیال اور انجیل سب میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ یہی نام زبان زد عوام و خواص ہو گیا۔ اگر اصل نام یہوذا ہوتا، جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے، تو پھر اس کی طرف نسبت یہوذی ذال کے ساتھ ہونی چاہیے تھی

نہ کہ دال کے ساتھ۔

تیسرا یہ کہ لفظ یہو کے ساتھ کسی ایسے ہی لفظ کو ملایا جا سکتا ہے جس کا ملا... ہو۔ لفظ ذا کوئی ایسا موزوں لفظ نہیں ہے جو کسی مخلوق کا نام رکھنے ... جائے۔ کیونکہ اس کے ملانے سے جو معنی بنتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اللہ ... کے لیے اس لفظ کا استعمال ایک نہایت ہی مکروہ سی بات ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن مجید نے یہاں اپنے عام ... کو ان کی ایک غلطی پر متنبہ کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ لفظ یہود جس ... منسوب کرتے ہیں اس کی اصل مادہ ہود سے ہے اور اس میں ایک لطیف ... طرف ہے کہ ان کے نام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ...

نصاریٰ : لفظ نصاریٰ کی تحقیق استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتا... بیان فرمائی ہے :-

" نصاریٰ نصران کی جمع ہے جس طرح ندامیٰ ندمان کی جمع ہے۔ شروع ... نام تھا اور ان کے متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے ... اس کو اپنی تحقیر سمجھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نصاریٰ بعد کے د... ہو گئے۔ ایک فرقہ نے خلیفہ برحق شمعون (پطرس) کی پیروی کی، اس ... سے موسوم کیا۔ اس گروہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ... لائے۔ یہی گروہ ہے جس کی قرآن نے مختلف مقامات میں تعریف ف...

اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارىٰ ۸۲

(دوستی میں ان لوگوں کو زیادہ قریب پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو نصاریٰ کہا)

تصریح ہے کہ قرآن کا ممدوح گروہ وہی ہے جس نے اپنے آپ کو نصاریٰ ... ان کے دوسرے فرقہ نے مبتدع (پولس دجال) کی پیروی کی، موجودہ عیس... والے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک نصاریٰ کا لفظ ایک تحقیر کا لفظ ہے۔ ا...

ؔ اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں تحقیق لفظ ...

گاؤں کی طرف نسبت ہے جو ایک نہایت حقیر سا گاؤں
"فلپس نے نتن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ
ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔" نتن
اچھی چیز نکل سکتی ہے۔" یہ بات اس گروہ کے تکبر کی
ناصرہ ہی ہے تو اس کی طرف منسوب ہونے میں حقارت
یہ دعویٰ بھی ہے کہ ناصرہ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش
پکارے جائیں گے۔ چنانچہ متی باب ۲-۲۴ میں ہے
اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت
بعض مخالفین قرآن نے اس لفظ کو بھی قرآن پر اعتراض
کہ چونکہ قرآن کو اس وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں تھا اس وجہ سے
سمجھا ہے اور سورہ صف کی اس آیت میں اس پہلو سے ان
مریم للحواریین من انصاری الی اللّٰہ قال
یاد کرو جب کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ خدا کی راہ
جواب دیا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں) ہمارے نزدیک ان
سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہاں قرآن مجید نے
ایک امر واقعی بیان فرمایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو
اس میں ایک لطیف تلمیح اس بات کی طرف ہے کہ جو لوگ
مددگار ہونا چاہیے کیونکہ اس کا اشارہ خود ان کے نام کے
تلمیحات انبیاء علیہم السلام کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔
سے جن کا لقب صفا تھا فرمایا کہ "اور میں بھی تجھ سے کہ
اپنی کلیسا بناؤں گا" باب ۱۶، ۱۸ [1]
صابئین ہود ابیشر کے متعلق اہل تاویل کے متعدد

---

[1] اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن

...محنتوں کی [illegible] نہیں دی بلکہ آگے چل کر اس کے استیصال [illegible] ہو گئے اور اس [illegible] [illegible] کی ہر ممکن [illegible] کی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ شمعِ حق کے پروانے اور اس پر جاں نثار [illegible] بھی قریشی ہونے دل و دماغ تھے۔ قریش ہی کا خونِ جگر تھا جس نے دعوتِ حق کے ننھے سے پودے کو پربار اور برگ و بار بنایا۔

جب دعوتِ حق ارتقائی مراحل طے کرنے لگی تو قریش کے ان فداکاروں کو دو طرح کی برتری اور تفوق نصیب ہوئی۔ ایک دعوتِ اسلامی کے اولین دست و بازو اور اس کے نظریہ و مسلک کے رازداں ہونے کی حیثیت سے اور دوسری برتری خاندان قریش سے ہونے کی وجہ سے جو قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ [illegible] طور پر قریش کو اس نئی دعوت میں بھی راہنمائی اور لیڈری کا مقام حاصل ہو گیا گویا باقی [illegible] رنگ بدل گیا [illegible] بھی تبدیل ہوا، روح تبدیل ہو گئی۔

اس حقیقت کو آں حضرتؐ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَيْشٍ فِي هٰذَا الشَّأْنِ مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ وَكَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِكَافِرِهِمْ وَالنَّاسُ مَعَادِنُ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا[1]

حکومت کے معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں ان میں کے مسلمان مسلمانِ قریش کی اتباع کریں گے اور کافر کفارِ قریش کے پیچھے چلیں گے۔ لوگوں کی حیثیت کان کی سی ہے جو جاہلیت میں بہتر مقام پر رہے ہیں وہ اسلام میں بھی بہتر مقام پر رہیں گے بشرطیکہ وہ اس شرف کے ساتھ دین کا تفقہ بھی حاصل کر لیں۔

ان احادیث کے آخری ٹکڑے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قریش کی یہ رفعت و عظمت ان کی ذاتی صلاحیت اور خاندانی امتیاز کی بنا پر ہے، سونا سونا ہی رہے گا خواہ اس پر گرد و غبار کی کتنی ہی تہیں چڑھی ہوئی کیوں نہ ہوں [illegible] اور [illegible] جائیں گے اس کی تابانی پھر نکھر کر سامنے آجائے گی۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا "قریش اپنی فہم و دانائی کے لحاظ سے دوسرے دو آدمیوں کے ہم پایہ ہیں۔"[2]

غالباً یہی حکمت تھی کہ جنگ [illegible] کے موقع پر تک مہاجرین جہاں خیمہ زن ہوتے وہیں آپ بھی اقامت فرماتے۔[3]

[1] بخاری کتاب المناقب، مسلم کتاب الامارۃ [2] مستدرک حاکم ج ۴ ص [illegible]، السنن الکبریٰ ج ۳ ص ۱۳۱
[3] مسند احمد [illegible]

تاکہ آپ کے ہرسو فہیم اور سمجھدار لوگ رہیں اور تعلیماتِ دین کو جذب کر سکیں۔

کہنے کا منشا یہ ہے کہ قریش محض اپنی مذہبی پروہتی کے باعث ہی سارے عرب پر قیادت نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں ان کے ذاتی شرف و کمال کا بھی دخل رہا ہے، اسی قبیلہ کے مخلصین نے جب اسلام کو اپنے سینہ میں جگہ دی تو پرچمِ قیادت بھی ان ہی کے حوالے کیا گیا۔

اسلام میں انصار کا مقام | اسلام کے آغاز میں جب اس کے چند ناتواں ہمنواؤں کو ریگ زارِ عرب پوری طرح جھلس دینے پر آمادہ تھا اور صحرائے عرب کی پہنائیاں ان پر تنگ ہونے لگی تھیں تو ایک نئے طبقہ نے اپنی بے مثال قربانیوں اور جاں فروشیوں سے دعوتِ حق کو استحکام بخشا اور اس کے مصیبت زدہ نام لیواؤں کو اپنے اندر جگہ دی، یہ طبقہ اپنی ان بیش بہا خدمات سے دعوتِ اسلامی کا دوسرا اہم عنصر قرار پایا اور آئندہ کے ہر موڑ میں اس کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

انصار کی یہ پوزیشن آں حضرتؐ نے اسی وقت واضح کر دی تھی جب کہ اہلِ مدینہ کے ایک نمائندہ نے بیعتِ عقبہ کے موقع پر دریافت کیا تھا کہ یا رسول اللہ اگر ہم اپنی کل متاعِ زیست حق کی سربلندی میں لگا دیں اور فی الواقع حق کا پرچم سربلند ہو جائے تو کیا آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے اصل وطن لوٹ جائیں گے؟ آپؐ نے جواب دیا ہرگز نہیں۔

اَلدَّمُ الدَّمُ وَالْهَدْمُ الْهَدْمُ أَنْتُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْكُمْ أُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَأُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ[1]

تمہارا خون میرا خون ہوگا تمہاری حرمت میری حرمت ہوگی تم جس سے جنگ کرو گے میں اس سے جنگ کروں گا تم جس سے صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:-

لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِنَ الْأَنْصَارِ وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَشِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْأَنْصَارِ وَشِعْبَهَا[2]

اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی میں کا ایک فرد ہوتا اگر سب لوگ کسی ایک وادی میں چلیں اور انصار کسی اور وادی میں تو انصار جس وادی میں چلے ہیں میں بھی اسی میں چلتا۔

یہ ایک سیاسی حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ بحیثیت امیر اس اہم عنصر کو

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۹۷، تاریخ کامل ج ۲ ص ۵۰ - [2] صحیح بخاری کتاب المغازی

اور قریش کے زیر اثر ہونے

کے دور میں بھی ابتدائی طرز کا

اس کی سرپرستی میں شوریٰ کے

ہمارے ایک قدیم مو

فَكَانَ قُصَيٌّ اَوَّلَ بَنِي

اَصَابَ مُلْكًا اَطَاعَ

اِلَيْهِ الْحِجَابَةُ وَ

وَالنَّدْوَةُ وَاللِّوَاءُ

كُلَّهُ ..... فَمَا تَنْكِحُ

رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ وَ

اَمْرٌ نَزَلَ بِهِمْ وَلَا يَعْ

قَوْمٍ فِيْ غَيْرِهِمْ اِلَّا

لَهُمْ لِبَعْضِ وُلْدِهٖ

اِذَا بَلَغَتْ اَنْ تُدْ

اِلَّا فِيْ دَارِهٖ يَشُقُّ

ثُمَّ تَدْرَعُهُ ثُمَّ

آں حضرتؐ کی ہجر

فَحَانَ تَمَّ اُخُوِّيْہِمْ

... قَدْ اَجْمَعَ

... فِيْ دَارِ النَّدْوَ

... الَّتِيْ كَا

---

[1] سیرت ابن ہشام

نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ انصار کی مرضی و نامرضی تمام اہم اقدامات میں فیصلہ کن قوت کی حامل ہوگی، اسی وادی کی طرف قدم بڑھائے جائیں گے جس وادی کی طرف انصار گامزن ہوں گے، جس پاسنگ میں انصار کی آراء ہوں گی یقیناً وہ بھاری ثابت ہوگا۔

مہاجرین و انصار کی حیثیت

اس طرح پہلے منبر پر مہاجرین بالفاظ دیگر قریش اور دوسرے منبر پر انصار یہ دونوں طبقے اس نئی تحریک میں ابھر کر سامنے آنے لگے۔ سقیفہ بنی ساعدہ (جہاں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تھی) کے موقع پر ایک انصاری مہاجرین سے خطاب کر کے کہتے ہیں:۔

إِنَّ رَسُولَ اللهِ كَانَ إِذَا اسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنْكُمْ قَرَنَ مَعَهُ رَجُلًا مِنَّا [1]

جب رسول اللہ تم میں سے کسی کو عامل مقرر کرتے تو ہمارے ایک آدمی کو بھی اس کے ساتھ بھیجتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوات میں مسلمانوں کے دو علم ہوتے تھے۔ انصار کا علم سعد بن عبادہؓ تھامے ہوتے اور پرچم مہاجرین حضرت علیؓ کے ہاتھ میں لہراتا [2]

جنگ بدر میں رئیس انصار سعد بن عبادہؓ شریک نہیں ہوتے تھے یا کسی اور وجہ سے ان کے بجائے علم انصار سعد بن معاذؓ یا حباب بن منذرؓ انصاری کے ہاتھ میں تھا اور مہاجرین کا جھنڈا بدستور حضرت علیؓ لیے ہوئے تھے [3]

ان دونوں طبقوں کی سابقیت و اولیت نے تحریکِ اسلامی[4] میں ایک ایسا بلند مقام حاصل کر لیا کہ تحریک کے وسیع سے وسیع تر ہونے کے باوجود ہر فرد ہر معاملہ میں ان ہی دونوں طبقات کی طرف نظر اٹھاتا تھا جس طرح سارا عرب اسلام کے بارے میں قریش پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھا اسی طرح تحریک اسلامی میں شامل ہونے والے بے شمار قبائلِ عرب اب ان دونوں طبقوں کی پالیسی کو اپنے لیے دستور العمل سمجھتے تھے وہ جس طرف دستِ صلح بڑھاتے ساری امت اس طرف امن و آشتی کے پیام بھیجتی وہ جس سے اعلانِ جنگ

[1] مستدرک حاکم ج ۳ صفحہ ۷۶ ۔ [2] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ صفحہ ۳۰ تذکرہ نمبر ۳۱۴۱ [3] سیرت ابن ہشام صفحہ ۴۳۳ البدایۃ والنہایۃ ج ۳ صفحہ ۲۶۶ ۔ [4] میثاق :۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے اسلام اور دعوتِ اسلامی کے لیے بعض جگہ تحریک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ چیز ہمارے مذاق کے خلاف ہے لیکن مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس مضمون کو کتابی شکل میں چھاپنے کی نوبت آئے تو مولانا سے ہماری درخواست ہے کہ اس طرح کے غلط فہمی پیدا کرنے والے الفاظ مضمون سے نکال دیں۔

کرتے ساری امت اس سے برسرِ پیکار ہو جاتی۔

نہ صرف سیاسی اور تحریکی حیثیت سے مہاجرین و انصار کو یہ تاجِ عظمت نصیب ہوا تھا بلکہ فہمِ دین اور اس کے رازداں ہونے کی وجہ سے بھی ملت کی قیادت کا انھیں حق حاصل تھا کیونکہ سب سے زیادہ ان ہی دو طبقوں کو شارحِ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت، علمِ دین اور تربیت کاملہ نصیب ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لِيَلِيَنِي أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهَى [1]

نماز میں مجھ سے قریب اہل علم و عقل رہیں۔

یہ "اولوالاحلام" کون تھے؟ یہ مہاجرین و انصار ہی کے گروہ تھے جیسے کہ ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے:

كَانَ يُحِبُّ أَنْ يَلِيَهُ الْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ فِي الصَّلَاةِ لِيَأْخُذُوا عَنْهُ [2]

آنحضرت چاہتے تھے کہ آپ کے قریب نماز میں مہاجرین و انصار رہیں تاکہ وہ آپ سے نماز کے طریقے سیکھ سکیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق اور قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہی دو گروہ امتِ مسلمہ میں عوامی پارٹیوں کی حیثیت رکھتے تھے اور لامحالہ ان ہی کو بست و کشاد کا حق حاصل تھا ان کا فیصلہ ساری امت کا فیصلہ ہوتا، وہ جس نقطہ پر متحد ہو جاتے امتِ مسلمہ بدل و جان اسے قبول کر لیتی۔

لیکن ان دونوں نے دورِ حاضر کی سیاست باز اور ایک دوسرے کی حریف پارٹیوں کی حیثیت سے میدانِ عمل میں قدم نہیں رکھا تھا بلکہ اس اتحادِ مقدس کی اساس دین پر رکھی گئی تھی، وہ دین جو ایک کو دوسرے کا غمگسار، شریکِ رنج و راحت اور مونس و غمخوار بناتا ہے جس کا ہر صفحہ درسِ اخوت و محبت دیتا ہے جس کا ہر کردار پیکرِ اخلاص و صداقت ہوتا ہے۔ چشمِ فلک نے ان کی اخوت و ہمدردی کا وہ نظارہ بھی دیکھا ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو اپنے مال و دولت میں برابر کا شریک و سہیم سمجھا تھا [3]

مقصد کے اس اتحاد اور یگانگت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مہاجر کے ہاتھ کو ایک ایک انصاری کے ہاتھ میں دے کر رشتۂ اخوت کو مزید ناقابلِ شکست کر دیا[4] تاکہ آپس میں اجنبیت اور نامانوسیت کا بالکلیہ خاتمہ ہو جائے اور ہر گروہ دوسرے کو اپنی ہی برادری سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ آج کا

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف۔ [2] السنن الکبریٰ ج ۳ صفحہ ۹۷ ۔ [3] اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی بین المہاجرین والانصار

[4] بخاری کتاب الادب باب الاخاء والحلف۔ تفصیل سیرۃ ابن ہشام میں ہجرت کے واقعات کے تحت دیکھی جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک ان "عزیزوں" میں میراث کا سلسلہ قائم رہا[1]

اس تشریح سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ انصار و مہاجرین ہی وہ عوامی جماعتیں تھیں جنھیں سیادتِ امت کا منصب حاصل تھا اور جو دینی خدمات اور فہم و بصیرت کی وجہ سے قدرتی طور پر مستحقِ حلّ و عقد قرار پائیں۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ یہ دونوں جماعتیں فکر و مسلک کے اتحاد اور آں حضرت کی قائم کردہ اخوت کے باعث ایک ہی گئی تھیں اس لیے نظمِ مملکت میں کونسی جماعت کا کتنا حصہ ہوگا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو پایا اگر کہیں اس قسم کی کوئی ناگوار صورت رونما ہوئی تو احساسِ برادری نے فوراً ہی اس پر پردے ڈال دیئے۔

مہاجرین و انصار کی سیاسی پوزیشن اگر آپ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ابن ہشام کی تاریخی تصریحات سامنے رکھیں گے تو یہ حقیقت از خود متعین ہو جائے گی کہ ان آپس کے بھائیوں میں کس کو سیادتِ امت کا حق حاصل ہے اور کس کی حیثیت شریکِ کار اور مشیروں کی ہے؟

آنحضرت نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا "لوگو! میں انصار کے بارے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں ان کے حقوق پہچانو، وہ میرے رازدار ہیں انھوں نے اپنا حق تو ادا کر دیا لیکن ان کا حق ادا نہیں کیا گیا، لہٰذا ان کے محسن کے حسن عمل کو قبول کرو اور ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرو"[2]

اس تقریر میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انصار کو نظم و نسقِ مملکت کا اختیار نہیں حاصل ہوگا لہٰذا جو طبقہ برسرِ اقتدار آئے وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور صالح روش اختیار کرے کیونکہ یہ جماعت اپنی سابقہ خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کے لحاظ سے ایسی ہے کہ اس کا وزن محسوس کیا جائے اور اسے وہ موقف حاصل ہو جس کی وہ فی الواقع مستحق ہے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطاب مہاجرین سے کیا تھا[3] جس کے بعد انصار و مہاجرین کے موقف کے تعین میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔

علاوہ ازیں آنحضرت نے بارہا اس بات کی تصریح کی ہے کہ قریش ہی مملکت کے سربراہ کار رہیں گے۔[4]

[1] بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر قولہ ولکل جعلنا موالی الخ، ابوداؤد کتاب الفرائض باب نسخ میراث العقد بمیراث الرحم۔ [2] بخاری کتاب المناقب باب قول النبی اقبلوا من محسنہم [3] تاریخ طبری ج ۳، ص ۱۹۶، البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۲۴۱ [4] بخاری کتاب الاحکام، مسلم کتاب الامارۃ

کیونکہ عرب سوائے قریش کے کسی اور علمِ اقتدار کے سایہ میں مجتمع نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار سے مخاطب ہو کر مہاجرین و انصار کی پوزیشن ان الفاظ میں واضح کی تھی۔

فَلَيْسَ أَحَدٌ بَعْدَ الْمُهَاجِرِينَ الْأَوَّلِينَ عِنْدَنَا بِمَنْزِلَتِكُمْ فَنَحْنُ الْأُمَرَاءُ وَأَنْتُمُ الْوُزَرَاءُ لَا تُفْتَاتُونَ بِمَشُورَةٍ وَلَا تُقْضَى دُونَكُمُ الْأُمُورُ[1]

مہاجرین اولین کے بعد ہمارے نزدیک تم سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی اور نہیں ہے، ہم امراء ہوں گے اور تم وزراء کسی معاملہ میں مشورہ کرتے ہوئے تمہیں الگ نہیں رکھا جائے گا اور تمہارے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں پائے گا۔

قریش کی اس سیاسی پوزیشن کا فلسفیانہ تجزیہ ہمارے فلسفی مورخ ابن خلدون کی زبانی سنیے:—

"درحقیقت قریش، مضر کا جوہر اور اس کا نچوڑ تھے، ان کو سارے عرب پر کثرتِ تعداد اور عصبیت کے لحاظ سے غلبہ و تفوق حاصل تھا، عرب ان کی اس برتری کو تسلیم کرتے تھے، اور وہ بطوع و رغبت ان کے زیرِ نگیں رہ سکتے تھے، اگر ان کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں کلید اقتدار ہوتی تو شیرازۂ امت کے پارہ پارہ ہو جانے کا اندیشہ تھا اور مضر کے دیگر قبائل میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ امت کو انتشار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچاتے ...... چونکہ نبی ہمیشہ امت کے اتحاد و اتفاق کا متمنی ہوتا ہے لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لیے قرشیت کی شرط لگادی تاکہ امت تحزب اور تفریق کا شکار نہ بن جائے۔ قریش کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ زورِ اقتدار سے لوگوں پر حکم نافذ کر سکتے تھے، اسی لیے ان کی قیادت میں کسی اختلاف کا اندیشہ نہیں تھا قریش کا اتحاد تمام قبائلِ مضر کے اتحاد کا ہم معنی تھا اور مضر کا اتحاد سارے عرب کے اتحاد کا ذریعہ بن سکتا تھا"[2]

مرکز ریاست مدینہ کی حیثیت انصار و مہاجرین کے موقف کے تعین کے بعد آئیے ہم تاریخ سے سوال کریں کہ کیا دورِ رسالت و خلفائے راشدین میں تمام اہم امور ان دونوں پارٹیوں کے مشورہ ہی سے طے پاتے تھے یا نہیں؟

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۸، الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۶

[2] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۹۰

ظاہر ہے کہ ان دونوں جماعتوں کا قیام دار السلطنت مدینہ ہی میں تھا یا کم از کم ان کے چیدہ اور نام آور اشخاص کی کثرت جن پر ہر معاملہ میں نظریں اُٹھ سکتی تھیں مدینہ ہی میں اقامت گزیں تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ اہلِ مدینہ کی رائے کو آخری حیثیت دے دی گئی اور مزید کسی رائے کے دریافت کرنے کی حاجت نہیں رہی

چونکہ ہماری آئندہ بحث اس امر پر منحصر ہے کہ اہلِ مدینہ کے اتحاد یا کثرت آراء ہی کو قانونی شکل حاصل تھی اس لیے ضروری ہے کہ مدینہ کی حیثیت متعین کر لی جائے۔

تاریخ کا ہر باخبر شخص واقف ہے کہ مدینہ کی ریاست خونی تلواروں اور نیزوں کے سایہ میں وجود پذیر ہوئی۔ مدینہ ہر سو سے دشمنوں کے تیروں کا ہدف بنا ہوا تھا کوئی شخص اس کے عروج و ارتقا کا تو کیا، بقا وسالمیت کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف ان ہی اربابِ عزیمت کو حاصل ہو سکتا تھا جو متاعِ زیست کا سودا کرنے کے لیے ہر آن آمادہ ہوں، جو موجِ حوادث سے مسکراتے ہوئے آگے نکل جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جو ہر ناخوش گوار حالت میں بھی پیمانِ وفا نبھانے کا عزم رکھتے ہوں، آں حضرتؐ نے اس حقیقت کا اظہار کس قدر لطیف پیرایہ میں کیا ہے کہ "مدینہ کی مثال بھٹی کی سی ہے جو کھوٹ کو چھانٹ دیتی ہے اور جو ہرِ خالص کو الگ کر دیتی ہے۔[1]

حضرت عمرؓ ایک حج کے موقع پر ایک اہم سیاسی و دینی تقریر کرنا چاہتے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا، امیر المومنین! ابھی اہم تقریر کے لیے یہ موقع کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ حج میں ہر قسم کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور بالعموم عام قسم کے لوگ ہی مقرر کے ارد گرد چھا جاتے ہیں اس سے ایک طرف تو اہلِ فقہ اور اربابِ بصیرت صحیح بات سن نہیں سکتے۔ اور دوسری طرف عوام جن باتوں کو سنتے ہیں ان کی تہہ تک ان کی رسائی ممکن نہیں، وہ بات کو بلا سوچے سمجھے موقع بے موقع منطبق کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا:-

فَأَمْهِلْ حَتَّى تَقْدَمَ الْمَدِينَةَ فَإِنَّهَا دَارُ الْهِجْرَةِ وَالسُّنَّةِ فَتَخْلُصَ بِأَهْلِ الْفِقْهِ وَأَشْرَافِ النَّاسِ فَتَقُولُ مَا قُلْتَ مُتَمَكِّنًا فَيَعِيْ أَهْلُ الْعِلْمِ مَقَالَتَكَ وَيَضَعُوْهَا عَلٰى مَوَاضِعِهَا[2]

مدینہ پہنچنے تک انتظار فرمایئے کیونکہ وہ دار الہجرت اور گہوارۂ سنت ہے وہیں آپ وہاں اہلِ فقہ اور قوم کے سرداروں سے الگ خطاب کر سکتے ہیں اور آپ اپنی مراد کو صحیح طور پر پیش کر سکتے ہیں جسے اہلِ علم حضرات پوری طرح محفوظ رکھیں گے اور موقع و محل پر اس کا انطباق کریں گے۔

[1] بخاری فضائل المدینہ باب المدینۃ تنفی الخبث الخ [2] بخاری کتاب المحاربین باب رجم الحبلیٰ من الزنیٰ اذا احصنت مسند احمد حدیث نمبر ۳۹۱ تاریخ طبری ج ۳ صفحہ ۵

علامہ حافظ ابن حجرؒ اس واقعہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:-

"اس واقعہ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اہلِ مدینہ علم و فہم کے لیے مخصوص تھے کیونکہ اس بات پر عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عمرؓ جیسی اہم ہستیوں نے اتفاق کیا ہے، ابن بطالؒ کے بیان کے مطابق محدث مہلبؒ کی یہی رائے ہے، ابن بطالؒ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ ہمارے خیال میں بھی اس دور کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے"[1]

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ کہتے ہیں "جب تم اہلِ مدینہ کو کسی معاملہ میں متفق دیکھو تو سمجھ لو کہ وہی حق ہے"[2] یہ ایک مسلّمہ حقیقت تھی کہ جس کے انکار کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا تھا، وہ بلوائی اور فتنہ باز جن کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت پیا تھا ان کی نگاہوں تک سے یہ حقیقت اوجھل نہیں رہی تھی چنانچہ وہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اہلِ مدینہ سے کہتے ہیں:-

يَا أَهْلَ الْمَدِيْنَةِ أَنْتُمْ أَهْلُ الشُّوْرٰى وَأَنْتُمْ تَعْقِدُوْنَ الْإِمَامَةَ وَحُكْمُكُمْ جَائِزٌ عَلَى الْأُمَّةِ فَانْظُرُوْا رَجُلًا وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ[3]

اے اہلِ مدینہ تم لوگ اہلِ شوریٰ ہو اور تمہیں کو امامت کے انعقاد کا حق ہے اور تمہارا ہی حکم ساری امت پر جاری ہے لہٰذا کسی آدمی کو خلیفہ منتخب کرو ہم تمہارے پیچھے چلیں گے۔

بلوائیوں کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا وہ اگر اپنے اقتدار اور قوت سے کسی کو خلیفہ منتخب کرتے تو اس پر امت کا اتفاق دشوار تھا، امت کے نزدیک وہی فیصلہ قابلِ قبول ہو سکتا تھا جس پر اہلِ مدینہ کی مہر لگی ہوئی ہو۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اہلِ مدینہ یا بالفاظِ دیگر مہاجرین و انصار ہی اربابِ حل و عقد تھے تو ہم اس کے اس دور کے شورائی نظام کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مہاجرین کی قیادت اور انصار کے مشورہ سے کس حد تک سیاسی امور انجام پذیر ہوئے اور امیر کے اختیارات کن حدود میں محدود رہے۔

نبی کریمؐ کی شوریٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملکی مسائل کبھی تمام اہلِ مدینہ کے براہِ راست مشورے سے طے کرتے تھے اور کبھی گفتگو مہاجرین و انصار کے نمائندوں تک محدود رہتی، بنیادی اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی اور دوسری صورت بھی اہلِ مدینہ کی رضا کا باعث ہوتی۔

[1] فتح الباری ج ۱۳ صفحہ ۱۳۶ ۔ [2] مختصر جامع بیان العلم وفضلہ صفحہ ۲۰۳ ۔ [3] تاریخ کامل ج ۳ صفحہ ۸۱

نمائندگانِ قبائل دورِ جاہلیت کے قبائلی نظام میں ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا، اسلام نے اس نظام کو باقی رکھا اور مناسب اصلاح کے بعد اپنے اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کیا۔

جس وقت انصار نے بیعتِ عقبہ میں آں حضرتؐ کی حمایت و نصرت کا حلف اٹھایا تھا اس وقت آپ نے انصار سے فرمایا کہ تم اپنے نمائندوں کو پیش کرو جو اپنی اپنی قوم کی تائید و حمایت کا ذمہ دار بنے، چنانچہ اسی وقت وفدِ مدینہ نے قبیلۂ خزرج کی مختلف شاخوں سے ۹ اور قبیلۂ اوس کے تین نمائندے پیش کیے جنھوں نے وفاداری و نصرت کا عہد کیا [1]

جنگِ ہوازن میں مالِ غنیمت اور بہت سارے قیدی عسکرِ اسلام کے ہاتھ آئے، اسلامی ضابطۂ جنگ کے مطابق ان قیدیوں کو فوج کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور وہ غازیوں کی ملکیت قرار پائے، تقسیم کے بعد قبیلۂ ہوازن نے دربارِ رسالت میں اپنے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست غازیانِ اسلام کے روبرو رکھی اور اس سلسلہ میں سفارش فرمائی جس پر ساری فوج کی جانب سے آمادگی کا اظہار ہونے لگا لیکن اس سے واضح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون اس پر آمادہ ہے اور کون نہیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا:۔

إِنَّا لَا نَدْرِيْ مَنْ أَذِنَ مِنْكُمْ فِيْ ذٰلِكَ مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوْا حَتّٰى يَرْفَعَ إِلَيْنَا عُرَفَاؤُكُمْ أَمْرَكُمْ فَرَجَعَ النَّاسُ فَكَلَّمَهُمْ عُرَفَاؤُهُمْ ثُمَّ رَجَعُوْا إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ فَأَخْبَرُوْهُ أَنَّهُمْ قَدْ طَيَّبُوْا [2]

ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی لہٰذا آپ لوگ لوٹ جائیں اور ہمیں آپ کے سردار آپ کی مرضی سے مطلع کریں، پس لوگ لوٹ گئے اور ان سے ان کے سرداروں نے گفتگو کی، بعد ازاں سردارانِ قبائل نے آنحضرتؐ کو اطلاع دی کہ وہ بخوشی اس پر آمادہ ہیں۔

اس واقعہ سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

ایک تو یہ کہ دورِ رسالت میں باقاعدہ عوام کے نمائندے پائے جاتے تھے۔

دوسری یہ کہ وہ عوام کے خیالات اور ان کی مرضی و ناراضی کے ترجمان ہوتے تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۹۷ تاریخ کامل ج ۲ ص ۴

[2] بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ و یوم حنین الخ، سیرت ابن ہشام ص ۸۷۶ - ۸۸۸

تیسری یہ کہ آنحضرتؐ قوم کے رجحانات سے واقف ہوئے بغیر کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔

حدیث میں "عرفا" کا لفظ آیا ہے جو عریف کی جمع ہے اس کی شرح مشہور شارحِ حدیث امام خطابی المتوفی ۲۷۵ھ اس طرح کرتے ہیں۔

اَلْعَرِيْفُ الْقَيِّمُ بِأَمْرِ الْقَبِيْلَةِ يَلِيْ أُمُوْرَهُمْ وَيَتَعَرَّفُ الْأَمِيْرُ مِنْهُ أَحْوَالَهُمْ

عریف قبیلہ کے نگراں کو کہتے ہیں جو ان کے معاملات کی سرپرستی کرتا ہے اور امیر اس کے ذریعہ ان کے احوال سے واقف ہوتا ہے۔

قَالَ الشَّاعِرُ

أَوَكُلَّمَا وَرَدَتْ عُكَاظَ قَبِيْلَةٌ بَعَثُوْا إِلَيَّ عَرِيْفَهُمْ يَتَوَسَّمُ [1]

ہماری ان تصریحات کا مزید ثبوت ابوداؤد کی ایک روایت سے بھی ہوتا ہے، امام ابوداؤد نے ایک شخص کی زبانی دورِ رسالت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ اور اس کے چشمے کا قیم اور ذمہ دار تھا۔ جب منادیٔ اسلام کی صدا اس کے گوشِ حق نیوش تک پہنچی تو اس نے اس صدا پر لبیک کہی اور اپنی قوم کو ایک سو اونٹ دے کر اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا لیکن ایک عرصہ بعد اس نے اپنے اونٹ واپس لے لینے کا ارادہ کیا اور اپنے اس ارادہ کی اطلاع اپنے ایک لڑکے کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ اس کے لڑکے کو اس کے بعد قبیلہ کا قیم بنا دیا جائے۔ آنحضرتؐ نے پہلی درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ تیرا باپ اگر اونٹ واپس لے لینا چاہے تو لے سکتا ہے کیونکہ اگر قبیلہ نے اسلام نہیں قبول کیا تو اس سے جنگ کی جائے گی۔ دوسری درخواست چونکہ روحِ اسلام کے منافی تھی اس لیے نہایت ہی لطیف انداز میں اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا:۔

إِنَّ الْعِرَافَةَ حَقٌّ وَلَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ عُرَفَاءَ وَلٰكِنَّ الْعُرَفَاءَ فِي النَّارِ [2]

قیمی حق ہے اور لوگوں کے لیے قیمین کا پایا جانا واجب و ضروری ہے لیکن قیمین دوزخ میں جائیں گے (اگر وہ قبائل کے حقوق کی رعایت نہ کریں)

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ محض سیادت اور حکمرانی کے جذبہ سے قیم بن جانا اور فی الواقع اس کے استحقاق سے عاری ہونا ہلاکت و تباہی کا موجب ہے۔

عرب کے نظام میں جو سردارانِ قبائل ہوتے تھے ان کے اندر بعض ایسی بنیادی اخلاقی صفات ہوتی تھیں

---

[1] معالم السنن ج ۳ ص [illegible] ۔ [2] ابوداؤد اول کتاب الخراج والفئ والامارۃ باب فی العرافۃ

مثلاً جود و سخا، شجاعت، حمیت، ایثار و بے نفسی وغیرہ جن کی وجہ سے قبیلے کے تمام افراد کی نگاہیں سرداری اور قیادت کے لیے اسی کی طرف اٹھتی تھیں اور ان کی سیرت و کردار پر قوم کو اس قدر اعتماد ہوتا تھا کہ وہ اس کے فیصلہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے، اسی خوبی کو موجودہ دور نے اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا ہے۔ اسی کے نمائندے دون ہمت اور ناقابلِ اعتماد سیرت و اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کسی بھی معاملہ میں بھلائی کی توقع فضول ہوتی ہے، قوم جن امیدوں کو ان کے ساتھ وابستہ رکھتی ہے۔ ان حسین خوابوں کی تعبیر کبھی عالم واقعہ میں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس وقت ایک واقعہ کا تذکرہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکے گا، کہ عرب کے نظام میں سردارانِ قبائل کی کیا حیثیت تھی اور قوم ان پر کیوں اعتماد کرتی تھی۔ پھر یہ کہ اسلام نے صرف نمائندوں کی رائے کو قوم کی رائے کا ہم معنی کیوں سمجھا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے پوچھا اے بنو سلمہ تمہارا سردار کون ہے ہم نے جواب دیا، جد بن قیس لیکن ہم اس میں ایک نقص پاتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ بخیل ہے، اپنی دولت کو قوم کی فلاح و بہبود میں صرف نہیں کرتا۔ آنحضرتؐ سن کر تعجب آمیز انداز میں فرمایا سردار اور بخیل ہو، بخالت سے بری بھی کوئی بیماری ہو سکتی ہے؟ آج سے تمہارے سردار عمرو بن الجموحؓ ہوں گے[1]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرداری کے لیے کن اوصاف کا پاس و لحاظ رکھا جاتا تھا اور آنحضرتؐ نے ان اوصاف کو کس قدر اہمیت دی ہے اور ان اوصاف عالیہ سے جو سردار عاری تھا اسے کس طرح اس کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔

آئیے ہم ان ہی بنیادوں پر دورِ رسالت کے شورائی نظام کا ایک اجمالی نقشہ پیش کریں جس سے آپ صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نمائندگانِ قوم کی آنحضرتؐ کے نزدیک کیا قدر و قیمت تھی اور اجتماعی معاملات میں ان کا کتنا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

مشہور تابعی سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں آنحضرتؐ کے پاس حضرت ابوبکرؓ کو ایک وزیر کا سا مرتبہ حاصل تھا جن سے آپ تمام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے[2]

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر تذکرہ عمرو بن الجموح، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ صفحہ ۵۲۹ نمبر ۵۷۹
[2] مستدرک حاکم ج ۳ صفحہ ۶۳۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ عرب جو روم و فارس کے نظامِ سلطنت سے واقف تھے حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرتؐ کا وزیر ہی کہا کرتے تھے[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں حضرت ابوبکرؓ سے امورِ مسلمین میں گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی شریکِ گفتگو رہتا[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کو کس طرح اپنا شریکِ کار بنائے رکھا تھا اس کا اندازہ آپ کے زندگی بھر کے رفیق حضرت علیؓ کے بیان سے کیجیے، فرماتے ہیں، بے شمار دفعہ میں نے آں حضرتؐ کی زبان مبارک سے اس قسم کے کلمات سنے ہیں: میں نے اور ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کام کیا، فلاں مقام پر میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ گئے ہوئے تھے، فلاں مقام سے میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ واپس ہوئے[3]

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ کہتے سُنا کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو مختلف مقامات پر تعلیم کی غرض سے روانہ کیا تھا میری بھی خواہش ہے کہ اسی طرح میں بھی کچھ آدمیوں کو اطرافِ ملک میں بھیجوں تاکہ وہ دین کی تعلیم دیں۔ یہ سن کر کسی نے کہا کہ کیوں نہ آپ اس کام پر ابوبکرؓ و عمرؓ کو لگا دیں۔ آپ نے جواب دیا "میں ان دونوں کو دور نہیں بھیج سکتا، اس دین کے معاملات میں ان کی حیثیت سمع و بصر کی سی ہے اس لیے میں ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا[4]"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سردارانِ امت کے مشورہ کو کیا اہمیت دیتے تھے اسے خود زبان رسالت مآب کے الفاظ میں سنیے:

لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشُوْرَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا[5]   اگر تم دونوں کسی معاملہ پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا

حدیث اور تاریخ کے صفحات شہادت دیتے ہیں کہ وزیر کی حیثیت صرف مذکورہ بالا دونوں ہی بزرگوں کے ساتھ مختص نہیں تھی بلکہ اس حیثیت میں تمام اکابر و اعیانِ ملت شریک تھے۔

حضرت علیؓ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ موسیٰؑ کے نزدیک ہارونؑ کی جو پوزیشن تھی وہی حیثیت تمہاری میرے نزدیک ہے[6]۔ گو کہ یہ قول ایک خاص پس منظر میں ارشاد ہوا ہے لیکن اس سے آنحضرتؐ کے نزدیک ایک اور مرکزی شخصیت کے تعینِ مرتبہ و مقام میں مدد ملتی ہے، طائف کی جنگ کے موقع پر آپ نے حضرت علیؓ سے تنہائی میں گفتگو فرمائی تو اس پر بعض لوگوں نے کہا آں حضرتؐ نے اپنے چچا زاد بھائی

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۰۶ ۔ [2] مسند احمد حدیث نمبر ۱۷۸، ترمذی ابواب الصلوٰۃ باب ما جاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء [3] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالہ صحیحین [4] مستدرک حاکم ج ۳ صفحہ ۷۵ [5] روح المعانی ج ۴ صفحہ ۱۰۶ بحوالہ مسند احمد [6] بخاری کتاب المناقب۔

ہم کلام ہیں، آپ نے یہ سن کر جواب دیا کہ اللہ نے مجھے اس سے سرگوشی کا حکم دیا ہے۔[1] یعنی وہ مستحق رازداری ہیں اور اہم معاملات میں ان سے گفتگو کرنا منشاءِ الٰہی کے عین موافق ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ جنگ خندق میں آنحضرتؐ نے جب یہ محسوس کیا کہ مشرکین کے اس ٹڈی دل لشکر سے فی الحال نمٹنا دشوار ہے اس لیے قبیلۂ غطفان کے سرداروں سے اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ مدینہ کی فصل کا ایک خاص حصّہ سالانہ انھیں دیا جائے گا لیکن جب سردارِ انصار سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ اس پر آمادہ نہیں ہوئے تو صلح نامہ چاک کر دیا گیا۔[2]

اس قسم کی اور بھی بہت ساری تصریحات پیش کی جا سکتی ہیں، لکھنے کا منشا صرف اس قدر ہے کہ دورِ رسالت میں باضابطہ اربابِ حل وعقد موجود تھے جن سے آپ ہمیشہ مشورہ فرماتے تھے، آنحضرتؐ کے شب و روز کے ایک رفیق حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:—

مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَکْثَرَ مَشُوْرَۃً مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

طباطبائی لکھتے ہیں:—

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یُشَاوِرُ اَصْحَابَہٗ دَائِمًا[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے ہمیشہ مشورہ کیا کرتے تھے۔

علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں:—

وَکَانَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُشَاوِرُ اَصْحَابَہٗ وَیُفَاوِضُھُمْ فِیْ مُھِمَّاتِہِ الْعَامَّۃِ وَالْخَاصَّۃِ وَیَخُصُّ مَعَ ذٰلِکَ اَبَابَکْرٍ بِخُصُوْصِیَّاتٍ اُخْرٰی[5]

آنحضرتؐ صحابہؓ سے اپنی عام و خاص مہمات میں مشورہ فرماتے تھے اور صحابہؓ میں بھی حضرت ابوبکرؓ سے خاص طور پر مشورہ کرتے تھے کیونکہ ان کے اندر بعض مخصوص خصوصیتیں تھیں جو اوروں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

(باقی)

[1] مشکوٰۃ کتاب المناقب بحوالہ ترمذی [2] تاریخ طبری ج ۳ صفحہ ۴۸ [3] امام ترمذی نے اس حدیث کو بلا سند نقل کیا، باب ما جاء فی المشورۃ لیکن امام شافعی اور امام احمد نے سند پیش کی ہے گو کہ اس میں ارسال ہے لیکن فقہاء و محدثین نے حسن کثرت سے اس روایت کو قبول کیا ہے اس سے یہ نقص بہت حد تک کم ہو جاتا ہے [4] الفخری صفحہ ۱۰۱ [5] مقدمہ ابن خلدون صفحہ [illegible]

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

(۵)

انبیاء کے صحیفوں خصوصاً زبور و امثال سلیمانؑ میں بھی یہ وعدہ موجود ہے کہ پیغمبر آخر الزمان اس گھر کو بت پرستی اور شرک و الحاد سے پاک کرے گا۔ قرآن مجید کی اس آیت سے بھی اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے:—

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء ۱۰۵)

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ارض سے مکہ ہی کی مقدس اور بابرکت زمین خاص طور سے مراد ہو سکتی ہے اس لیے کہ شرف و تقدم کی جو خصوصیت و فضیلت اسے حاصل ہے وہ اس آسمان کے نیچے کسی گوشۂ زمین کو بھی حاصل نہیں اور حضرت موسیٰؑ نے بھی آنحضرتؐ کے متعلق یہی بشارت دی تھی کہ جب وہ نبی موعود آئے گا تو ارض مقدس کو کفار کے غلبہ و استیلاء سے پاک کرے گا۔ بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء و سلاطین گذرے ہیں ان میں سے کسی کے عہد میں اس پیشین گوئی کی تصدیق نہیں ہوئی اسی لیے یہود کو ایک ایسے پیغمبر کا نہایت بیتابی اور شدت کے ساتھ انتظار تھا جو ارض مقدس کو کفار کے غلبہ و استیلاء سے پاک صاف کرے قرآن نے اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَھُمْ کِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کی کتابوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق تھی اور حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے کافروں پر غلبہ و فتح پانے کے

جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (البقرہ ۸۹)

آرزومند تھے لیکن جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے وہ پہچانتے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔

یہود و نصاریٰ دونوں کی کتابوں میں نہ صرف اس نبی کی پیشین گوئی کی گئی تھی بلکہ اس کے اس سرزمین میں مبعوث ہونے اور اس پر ایمان لانے اور اس کی حمایت و نصرت کرنے کا عہد و پیمان بھی ان سے لیا گیا تھا چنانچہ فرمایا :-

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۔ (آل عمران ۸۱)

اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ ہم جو کتاب و حکمت تمہیں دیں پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس چیز کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو اس پر ضرور ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ خدا نے (پیغمبروں سے) پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا انھوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا تو اللہ نے کہا اچھا اپنے اس قول و قرار پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب دیتے ہوئے اس سے بھی زیادہ وضاحت و تفصیل کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے :-

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ

خداوند نے کہا میں اپنا عذاب جسے چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے پس اس کو میں ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی وہ جو اس نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جسے اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو حکم دیتا ہے اچھی بات کا اور روکتا ہے بری بات سے اور ان کے لیے حلال کرتا ہے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ناپاک چیزیں اور دور کرتا ہے ان سے ان کے وہ بوجھ

وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اعراف ۱۵۶، ۵۷)

اور پھندے جو ان پر تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کی حمایت کی اور مدد کی اور پیروی کی اس روشنی کی جسے دے کر وہ بھیجا گیا تو وہی لوگ کامیاب ہوں گے

غرضیکہ اس نبی کی بعثت اس کی وہ جملہ خصوصیات جو آپ کے حالات کے ہو بہو مطابق تھیں سب گزشتہ صحیفوں میں موجود و مذکور ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے ان تصریحات کو قلم انداز کر دیا ہے اور صرف ضروری اشارات پر اکتفا کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آنحضرت صلعم کا اس سرزمین میں مبعوث ہونا، اپنی اس دعوت و تبلیغ کا یہیں سے آغاز کرنا جو عین ملتِ ابراہیمی کی حقیقت ہے۔ آپ کے ذریعہ دینِ حنیفی کا قیام و اتمام عمل میں آنا، اس گھر کو شرک و بت پرستی سے پاک کر کے اس مقصد تک لے جانا جو اس کی تعمیر کا اولین مقصود تھا اور سارے لوگوں کو اس گھر کے حج و زیارت کی تلقین کرنا تاکہ وہ دینِ ابراہیمی کے رنگ میں رنگ جائیں اور یہاں سے اسلام و اطاعت، قربانی و حق پرستی کا سبق لینا وغیرہ سب آپ کی اور اس گھر کی عظمت و فضیلت کا ثبوت ہیں۔

۹ ۔ خانۂ کعبہ کمالِ اسلام کی تصویر ہے اس امر کے چند پہلو ہیں اس لیے وضاحت کی غرض سے ان کا تجزیہ کر دینا مناسب اور مفید ہوگا۔

۱۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی سرگزشت۔

۲ ۔ ان دونوں باپ بیٹوں کا حق پرستی اور اسلام و اطاعت کے لیے بیت اللہ کو بنانا۔

۳ ۔ یہاں اپنے محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کرنا۔

۴ ۔ نبی آخر الزماں اور ایک امت مسلمہ کے ظہور کی دعا کرنا تاکہ وہ اصلی اسلام کی ترجمان اور ان کے شعائر و مراسم کو قائم و باقی رکھے۔

دوسری اور تیسری شقیں بھی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی سیرت ہی کا ایک ایک گوشہ اور حصہ ہیں لیکن اپنی جگہ خود اس قدر اہم کہ ان کو الگ اور مستقل حیثیت دینا غلط نہیں ہے اور ان تمام پہلوؤں پر پہلے بحث گزر چکی ہے اب مزید شرح و اطناب کی ضرورت نہیں تاہم ناگزیر حد تک ان کی اجمالی تشریح کر دینا مناسب ہے تاکہ خانۂ کعبہ کا کمالِ اسلام کی تصویر ہونا واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں خدا کے مخلص ترین اور اطاعت گزار بندے اور خدا پرستی اور شرک بیزاری کا کامل نمونہ تھے۔ ان کی ساری زندگی اسلام و احسان محور کے گرد چکر لگاتی رہی تھی۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام ۷۹)

میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کا مشرکانہ ماحول میں دلائل و براہین کے ساتھ اپنی دعوت توحید پیش کرنا، باطل خداؤں سے اظہار بیزاری کرنا، ماں باپ، بھائی بند، اعزہ و اقارب، قوم و ملک اور بادشاہ وقت کی مخالفت مول لینا، گھر بار چھوڑ کر ملکوں اور ویرانوں کی خاک چھاننا۔ شام و عراق اور حجاز میں اپنی اولاد کو بسانا اور اقامت توحید کے لیے اپنی تمام لذتیں، آسائشیں، متاعِ حیات، سرمایۂ زندگانی اور سب سے محبوب اور مرغوب چیز قربان کر دینا دراصل ان کے کمالِ اسلام، کمالِ اخلاص اور کمالِ اطاعت کا ثبوت ہیں۔ دوسری طرف حضرت اسماعیلؑ کی زندگی پر غور کرو کہ وہ بھی صبر و رضا اور اطاعت و اسلام میں ان کے شریک اور نمونہ تھے، ایک کی اگر ساری زندگی حق اور اطاعت خداوندی کے لیے وقف تھی تو دوسرا بھی صبر و رضا اور تسلیم و اطاعت میں ان کا متبع تھا۔ اس نے بھی فدویت و جاں نثاری کا حق ادا کر دیا تھا اور اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی تھی ؎

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل — خود زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بہرحال ان دونوں مقدس نبیوں کی زندگی کے جتنے ورق الٹو سب اسلام و احسان ہی کے اوراق ہوں گے۔

اسی طرح اس گھر کی بنیاد کمالِ اسلام پر رکھی گئی۔ لوگوں کے حج و زیارت اور نذر و قربانی کا مرکز ہی نہیں خدا پرستی کا مظہر بھی ہے۔ اس کے حج و طواف کرنے کے معنی اسلام و ایمان کے سرچشمے سے سیراب ہونا ہے یہاں کی خاک کے ذروں سے وحدت الٰہی کے نغمے سنائی دیتے ہیں اور ابراہیمی دعوت گونجتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کی خشت و خاشاک کے اندر بھی صبر و تسلیم اور ایمان و اسلام کی ہزاروں داستانیں پوشیدہ ہیں۔ یہاں کے گلی کوچے سب اطاعت و قربانی کی ترجمانی اور شرک و بت پرستی سے نفرت کی گواہی دے رہے ہیں، اور اسلام و ایمان ہی کی تصویریں ہر طرف نظر آتی ہیں۔

قربانی کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ خانۂ کعبہ کے پاس ہوتی تھی، یہاں صرف اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ قربانی حقیقی اسلام کی جامع ہے کیونکہ اسلام کا مطلب اطاعت و سرفگندگی، اپنے نفس کو خدا کے حوالہ کرنا اور اس کے لیے اپنی عزیز ترین متاعِ حیات حتیٰ کہ جان کو بھی قربان کر دینا اور قربانی اس کا بالکل عملی اور بدیہی ثبوت اور ہمہ تن جذبۂ آمادگی کا اظہار و اقرار ہے۔ اس کی حقیقت بھی یہ ہے کہ اپنی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو خدا کی مرضی کے سامنے ہیچ سمجھنا اور اس کے لیے سب کچھ حتیٰ کہ جان جیسی عزیز چیز بھی پیش کر دینا۔ ہماری موجودہ قربانی تسلیم و اطاعت کے ایک مہتم بالشان واقعہ کی یادگار ہے اس لیے ہم بھی اسی اطاعت و عبدیت کی یادگار میں قربانی کرتے ہیں اور اپنے نفس کو آزمائشوں اور بڑی قربانی کا خوگر بناتے ہیں اور ذکر و شکر، صبر و توکل اور تقویٰ و احسان کے مراتب حاصل کرنے کی جستجو کرتے ہیں اس طرح قربانی اسلام کا اصل نقشہ ہے۔

آخری پہلو بھی پہلے زیرِ بحث آ چکا ہے کہ نبی اکرم صلعم کی بعثت دعاء ابراہیمی کے مطابق دینِ ابراہیم کی تکمیل و تشریح کے لیے ہوئی تھی، آپ نے اسلام کی اصل حقیقت بیان کر کے اسے یہودیت، نصرانیت اور مشرکین کے دینِ باطل کی آلائشوں سے پاک صاف کیا، آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والی ایک امت یہاں سے برپا ہوئی جو دینِ ابراہیمی اور حقیقی اسلام کی اس دنیا میں علمبردار اور گواہ ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ (حج ۷۸)

اور اللہ کی راہ میں اس طرح کوشش کرو جس طرح کرنا چاہیے اس نے تمہیں منتخب کیا اور تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں پیدا کی، وہ دین تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام اس سے پہلے مسلمان رکھا، اور اس ملت میں بھی تاکہ رسول تم پر اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔

گویا یہ نبی اور اس کی امت بھی جو یہیں برپا ہوئی دینِ ابراہیمی جو اخلاص و ایمان، صبر و طاعت اور فدویت و جاں نثاری سے عبارت ہے کی ترجمان اور شاہد ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اغراض و مقاصد پورے ہوئے جس کے لیے خانۂ کعبہ بنا تھا۔ اسی لیے وہ اس گھر کی حفاظت اور پاسبانی کی زیادہ حقدار ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ اس نبی اور امت کا ظہور مرکزِ اسلام و توحید میں ہوا تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حقیقی اسلام کی

تعلیم ساری دنیا میں پھیلائے اور اس کی امت اس کی تعلیم و دعوت کی ترجمانی اور گواہی دے ۔

اب ان تمام پہلوؤں کو یکجا رکھ کر دیکھیے کہ مجرد خانہ کعبہ کس طرح ایمان و اسلام کی اصل تصویر پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد حضرت ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کے مقدس اور بابرکت ہاتھوں سے اس لیے رکھی گئی کہ وہ اسلام و ایمان کا اصلی مظہر بنے۔ انھوں نے یہاں اپنے محبوب اور اکلوتے بیٹے کی خدا کے حکم سے قربانی کرنی چاہی اور قربانی کی روح تمام تر یہ ہے کہ اپنا سب کچھ راہِ الٰہی میں تج دے کر عدل و احسان اور نیکی و تقویٰ کے بلند ترین مراتب حاصل کیے جائیں اور چونکہ وہ خانہ کعبہ کے پاس ہوئی تھی اس لیے وہ اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ ایک پیغمبر اور امت کے ظہور و قیام کی دعا کی تاکہ کمالِ اسلام کی حقیقی ترجمان اور دینِ ابراہیمی کی اولین علمبردار بنے اور چونکہ وہ نبی اور امت یہیں سے برپا ہوئی اس لیے خانہ کعبہ کا وجود بھی اسلام کی ترجمانی و تعبیر ہے۔

اس لیے جو لوگ حج کے لیے دور دراز کے گوشوں سے سفر کر کے جوش و مستی اور عقیدت و شیفتگی کے والہانہ جذبات میں سرشار ہو کر "لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک ان الحمد والنعمۃ لک" کہتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے سامنے خانہ کعبہ کے کمال اسلام ہونے کی تمام صورتیں ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتی ہیں اور وہ اس ماحول میں جا لیتے ہیں جس میں اس گھر کی بنیاد اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے رکھی گئی تھی اور وہ جب یہاں کے ذرہ ذرہ کو اسلام کی ترجمانی اور تفسیر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کا دل بھی شکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے اور ان کے اندر بھی یہ حرکت و ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مقصدِ حیات بھی دینِ ابراہیمی کی تبلیغ و نمائندگی ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف خانہ کعبہ کی زیارت بلکہ کمال اسلام کی تصویر دیکھتے اور جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں جس سے ان کا دل پُرنور، طبیعتیں شگفتہ اور باغ و بہار ہو جاتی ہیں اور چمنستانِ ہستی کا ہر ہر گوشہ جگمگا اٹھتا ہے ۔

۱۰۔ خانہ کعبہ کی فضیلت کا دسواں ثبوت یہ ہے کہ وہ کوثرِ آخرت کی تصویر اور روحانی تمثیل ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ کوثر کی تفسیر میں اس پر نہایت بصیرت افروز بحث کی ہے۔ یہاں اسی کا خلاصہ نقل کیا جائے گا، لیکن اس سے پہلے اس قدر وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ یہ خیال یعنی کعبہ حوضِ کوثر کے مشابہ ہے کوئی نیا خیال نہیں اور نہ وہ روایات اور سلف کے مسلک کے خلاف ہے بلکہ قرآن و حدیث میں کامل درجہ کی تطبیق اور نہایت دل نشین اور خوبصورت تاویل ہے کیونکہ کوثر کے متعلق

اگرچہ متعدد اقوال منقول ہیں لیکن وہ سب دو مذہبوں کے اندر محصور کیے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد ہے جیسے حوضِ موقف یا نہرِ جنت اور قرآن یا نبوت، حکمت اور اسلام وغیرہ۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ ہر چیز جس میں خیرِ کثیر ہو اس کے دائرہ میں داخل ہے۔ پہلے مذہب کو ماننے والوں کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہرِ جنت کا ذکر کوثر کے نام سے فرمایا ہے اور جو لوگ اس کو نہر اور نہر کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے عام مانتے ہیں وہ حدیث و قرآن میں تطبیق دینا چاہتے ہیں اور قرآن کی تاویل اس کی عبارت کے منشاء کے مطابق اور حدیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اس لیے ان دونوں باتوں میں بھی باہم کوئی اختلاف نہیں بلکہ دونوں تاویلوں میں جمع و تطبیق کی ایک شکل ہے اور اس سے حدیث کی مخالفت بھی نہیں ہوتی البتہ یہ بات اپنی جگہ ضرور محلِ نظر ہے کہ ہر چیز جس میں خیرِ کثیر ہو وہ ضروری نہیں کہ حوضِ موقف اور نہرِ جنت کے مشابہ ہی ہو۔ اسی لیے ہم نے قرآن و حدیث میں کامل توافق اور تطبیق پیدا کرنے کے لیے یہ راہ اختیار کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جو کوثر دنیا میں عطا فرمایا ہے وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض یا جنت کی نہر ہے اور یہ سلف کے مسلک سے جدا کوئی نیا مذہب نہیں اور نہ اس سے کوثرِ آخرت کا انکار لازم آتا ہے بلکہ جس طرح سلف نے اس کے دائرہ میں وہ چیزیں داخل کر لی ہیں جو داخل ہو سکتی ہیں تاکہ لفظ عام و وسیع اور اپنی دلالت کے اعتبار سے اسم بامسمّیٰ (کوثر) ہو جائے۔ چنانچہ بعد کے علماء نے بھی اس میں مزید تلاش و جستجو جاری رکھی، اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہی ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور خود سلف سے اس باب میں اختلاف نہ منقول ہوتا۔ اس لیے ایک ایسی تاویل جو دونوں تاویلوں کو جمع کر دے بہترین تاویل ہے اور وہ کسی طرح بھی مذہبِ سلف کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خانہ کعبہ کو اس حوض یا نہر سے نہایت گہری مناسبت اور واضح درجہ کی مشابہت ہے جس کی کیفیات اور حقائق آنحضرت صلعم نے بیان کیے اور جس کی حقیقت و روحانیت کے جلوے شبِ معراج میں آپ کو نظر آئے کیونکہ یہ بالکل مسلّم ہے کہ اس مبارک اور میمون رات میں جب پروردگارِ عالم نے اس عالمِ آب و گل کی بہت ساری چیزوں کے حقائق آپ کے لیے بے حجاب کیے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا گیا جو اس دنیا میں آپ کو بخشا گیا تھا۔

آنحضرتؐ نے جس نہرِ کوثر کا مشاہدہ عالمِ قدس میں فرمایا تھا اس کے اوصاف و خصائص پر غور کرنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ دراصل میں کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی تصویر ہے چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف روایات مروی ہیں اور ان سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ :-

"کوثر ایک نہر ہے، اس کے کنارے پر مجوف موتیوں کے محل ہیں۔ اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں آسمان کے ستاروں کی طرح ظروف ہیں اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اس پر چڑیاں اترتی ہیں، جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں ایک شخص نے کہا اے رسول اللہ تب تو وہ بہت خوش قسمت ہوں گی، آپ نے فرمایا ان کے کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش قسمت ہوں گے، اس کے پانی کی آواز ایسی محسوس ہوگی جیسے تم اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ہو"

یہ حوض کوثر کی مثال تھی لیکن اسے خانہ کعبہ سے کتنی زیادہ مناسبت اور مشابہت ہے۔ جب دنیا کے گوشے گوشے سے موحدین کے قافلے عشق و محبت الٰہی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کی نگاہ میں اس وادی کے سنگریزے یاقوت و زمرد سے زیادہ پرجمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے اردگرد حاجیوں کے خیمے مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ حجاج اور ان کے ساتھ اونٹوں کی قطاریں اصل میں ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ ہیں۔ ان کی خوش بختی اور فیروزمندی کا یہ حال ہے کہ وہ اشرف المخلوقات انسان کے قائم مقام ہو کر خدا کے سامنے قربان ہوتے ہیں۔ پھر ان کے کھانے والوں کی خوش قسمتی نہ پوچھیے وہ اللہ کے مہمان ہیں اور اللہ کے مہمانوں سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہوگا۔

اب چند مقدمات اور دلائل بیان کر کے خانۂ کعبہ اور حوض کوثر کی مطابقت واضح کی جاتی ہے۔

۱۔ انسان کے اندر فطرۃً خدا کی طرف شوق و رغبت کا داعیہ موجود ہے اسی فطرت و طبیعت کی وجہ سے وہ مذاہب و ادیان سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طلب، اشتیاق اور بے قراری کی سب سے عمدہ تعبیر پیاس ہے چنانچہ وہ بندگانِ خدا جو سراپا شوق و آرزو بن کر حج کے زمانے میں بیت اللہ کے پاس جمع ہوتے ہیں ان کی مثال بعینہٖ ان خشک لب پیاسوں کی سی ہے جو شدید تشنگی سے مجبور ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو خانۂ کعبہ ان کے لیے اسی دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے جس پر وہ میدان حشر میں یکجا ہوں گے۔

۲۔ آنحضرت صلعم نے مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اگر کسی کے دروازہ پر ایک نہر ہو اور وہ روزانہ پانچ مرتبہ اس میں نہاتا ہو تو اس کے جسم پر میل کچیل باقی نہیں رہتی اسی طرح نماز پڑھنے والا گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ یہ تشبیہ ایک اعتبار سے پانی ہی کی ہے کیونکہ وہ سیرابی کی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہماری نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے اس لحاظ سے تمام مسجدیں گویا اس سرچشمہ کی نہریں ہوئیں جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ جس طرح حوض کوثر پر امت کا اجتماع و اژدہام ہوگا اسی طرح خانۂ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع و اژدہام ہوتا ہے تاکہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کثرت ظاہر ہو یعنی حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء کی امتوں پر اس کی کثرت کا اظہار مقصود ہے ٹھیک اسی طرح موسم حج میں خانۂ کعبہ کے آس پاس اس کا اجتماع اظہار کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ فتح مکہ امت کی کثرت کا باعث بنا اور حج اکبر کے بعد لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے اس طرح بیت اللہ امت کی کثرت کے اظہار کا دنیا میں ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے جس طرح حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے اظہار کثرت مقصود ہوگی۔

۴۔ مسجد حرام خیر و برکت کا سرچشمہ ہے جیسا کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ سے صاف ظاہر ہے چنانچہ اس گھر کو خدا نے ایسی برکتوں سے نوازا کہ سارا عالم اس گھر کی برکتوں سے مالامال ہوا اور بنی اسحاق کے مقابلہ میں بنی اسماعیل کو زیادہ برکتیں حاصل ہوئیں، بس اس کا مبارک ہونا حوض کوثر سے اس کی مشابہت کی ایک دلیل ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کو بھی مبارک کہا گیا ہے لیکن وہ بارش کے اعتبار سے کیونکہ وہ آسمان سے برتی ہے تو مردہ زمین میں جان آجاتی ہے اور قرآن نے بھی آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دی۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی امت کو حوض کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانوں گا اور یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص نیت کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے وہی آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۶۔ آپ نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلق فرمایا کہ :-

ما بین بیتی و منبری روضة من ریاض — میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کا ایک

الجنة ومنبری علیٰ حوضی — جنت ہے اور میرا منبر میرے حوض کے اوپر ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین جہاں حجاج اکٹھے ہوتے ہیں اور جو توحید و اسلام کا مرکز ہے۔ اس حوض کوثر کی شکل اختیار کرلے گی جس کا آخرت میں آپ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے اپنے حوض کا طول مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت کے بقدر بیان کیا ہے اس سے ارض حرم اور آپ کے حوض میں مطابقت کا پہلو بھی واضح ہوگیا۔

۷۔ ایک مرتبہ آپ نے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھائی پھر منبر پر تشریف لائے اور فرمایا "میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں اور تمہارے لیے شہادت دوں گا اور قسم ہے خدا کی میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں ....." اس روایت میں آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے آپ نے اشارہ فرمادیا کہ کوثر آخرت کی مثال دنیا میں بھی آپ کے سامنے ہے۔

لیکن یہاں ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر خانۂ کعبہ حوض کوثر کی اس دنیا میں تعبیر و تمثیل ہے تو اسے وضاحت کے ساتھ بیان کردینا چاہیے تھا۔ اس قدر اشارات اور کنایات سے کیوں کام لیا گیا اور آپ نے صراحت کے ساتھ کیوں نہیں فرمایا کہ خانۂ کعبہ قیامت کے دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم پر اس عالم کے جو اسرار و خفایا بے نقاب ہوتے تھے، آپ ان کا ذکر کبھی تصریح کے ساتھ فرمادیتے تھے مثلاً دنیا کے متعلق آپ نے فرمایا کہ "وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی" اور موت کے بارہ میں فرمایا کہ "وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی" لیکن کبھی صرف اشارات اور کنایات پر اکتفا فرماتے تاکہ لوگ غور و فکر کریں اور ان کے ذہن و عقل کی تربیت ہو اور وہ اشارات ہی سے تفصیلات اور حقائق کا استنباط کرلیں جیسے تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

قرآن مجید ہمیشہ دعوت فکر و نظر دیتا ہے، اس کا حامل بھی بہترین معلم اور مربی تھا وہ عقل انسانی کی تربیت کرتا تھا اور ذہن کو اکتساب حکمت کے قابل بناتا تھا اس لیے آپ نے کبھی کبھی صحابہ سے بعض امور کی مخفی مناسبتوں کے متعلق سوال کیا مثلاً آپ نے پوچھا کہ "درختوں میں مومن سے سب سے زیادہ اشبہ کونسا درخت ہے" حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی امثال میں گفتگو فرماتے تھے اور جب پوچھا گیا کہ آپ کھول کر باتیں کیوں نہیں کہتے تو فرمایا "تاکہ عقلمند ہی سمجھیں"۔

قرآن نے بھی اس آیت میں یہی بات بیان کی ہے ۔

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (عنکبوت) — یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف اہل علم سمجھتے ہیں۔

بہرحال اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ خانہ کعبہ حوض کوثر کے مشابہ ہے اور یہ بات کہ دنیا میں کعبہ کوثر آخرت کی مثال ہے کعبہ کی عظمت و جلالت کی ایک اہم دلیل اور مبین ثبوت ہے۔ خانہ کعبہ کی یہ چند خصوصیات تھیں جو اس مضمون میں تحریر کی گئی ہیں۔ آخرہ اگر اور پہلو سامنے آئے تو ان صفحات میں ان کا بھی ذکر کیا جائے گا، اس موضوع پر لکھتے وقت چند اور مستقل عنوانات سامنے آئے جن کا براہ راست اس سے تعلق ہے اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو آئندہ ان پر بھی لکھا جائے گا۔

اخبار اہلِ حدیث مفت

اخبار اہل حدیث دوبارہ جاری ہوگیا ہے اگر آپ اسے مفت دیکھنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک خط پر بیس عدد پڑھے لکھے اہل حدیث خیال بھائیوں کے مکمل پتے ہمیں لکھ بھیجیں بلکہ غرض ہے کہ پتے مختلف مقامات کے اور خالص اہل حدیث حضرات ہی کے ہوں۔ خط جلد لکھ کر پرچہ منگوالیجیے۔

ناظم دفتر اخبار اہل حدیث سوہدرہ (گوجرانوالہ)

اعلان

رسالہ سے متعلق اپنی شکایات۔ اطلاعات اور دیگر خطوط ہمیشہ مینیجر ماہنامہ میثاق کو ارسال فرمائیں اور مضامین کے بارے میں اپنے مراسلات ایڈیٹر کو بھیجیں۔ خط و کتابت کرتے وقت پتہ مکمل اور صاف لکھیں

مینیجر ماہنامہ میثاق لاہور

اطلاع (مکتبہ میثاق)

آپ ہر قسم کی دینی اور علمی کتب مکتبہ میثاق سے طلب فرماسکتے ہیں۔ اگر مطلوبہ کتب کی قیمت چار روپے سے کم ہے تو آٹھ آنے محصول ڈاک زائد ارسال فرمائیں (وی پی کے ذریعہ طلب فرمانے پر کمی کی گنجائش ہے)۔ بھارت کی کتابوں کے لیے پہلے سے خط لکھ کر دریافت فرمالیں ۞

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

کراچی سے جدّہ

کراچی تک کے سفر کو تو مجھے سفر نہیں شمار کرنا چاہیے کیونکہ جہاں تک کم از کم میرا تعلق ہے، کراچی میرے لیے بمنزلۂ گھر کے ہے۔ یہاں میرا سارا وقت دوستوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوتا رہا۔ اسی دوران میں میں نے کسی مختصر سے مختصر پروگرام کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہیں لی تاکہ ذہن ہر قسم کے تردد سے آزاد رہے۔ سفر کے جو انتظامات باقی رہ گئے تھے وہ برادرم سلطان احمد صاحب سے متعلق تھے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے پہچاننے اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے معاملہ میں صرف آپ اپنی نظیر ہیں۔ البتہ کراچی کے بعد سے نیا اور اصل سفر شروع ہونے والا تھا۔

مجھے سمندر اور جہاز کی کچھ ایسی فکر نہیں تھی۔ میں اس سے پہلے بحری سفر کے دو تجربے کر چکا تھا اور سمندر کے سرد و گرم سے اچھی طرح واقف تھا۔ فکر جو کچھ تھی وہ اس سفر کی مخصوص نوعیت کی وجہ سے تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے اور وہ پریشان کرتے۔ اگرچہ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے سارے کام پروگرام کے مطابق انجام پا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک گہرے قسم کا تردد میرے ذہن پر برابر مسلط رہا۔ میں نے اس تردد کو اپنے امکان کی حد تک دوستوں سے چھپایا۔ صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا کہ مجھے یکسوئی اور اعتماد کی دولت نصیب ہو اور اگرچہ میں ایک نہایت ہی گنہگار اور آلودہ بندہ ہوں لیکن وہ مجھے قبول فرمائے اور ان مبارک اور پاک مقامات تک پہنچائے جن تک پہنچنے کے لیے میں گھر سے نکلا ہوں۔

جہاز کی روانگی کے دن (۱۰ ارمئی کو) ہم ظہر سے پہلے گھروں سے بندرگاہ کے لیے روانہ ہو پڑے۔ یہاں ہمیں کسٹم کے مرحلہ سے گزرنا تھا جس کی دارو گیر اور جس کا شور و ہنگامہ ضرب المثل ہے۔ میں نے دل میں بار بار دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے تمام پیش آنے والے حالات سے عہدہ برا ہونے کی ہمت دے۔ پہلے ہمارا سامان کسٹم کے

پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ پھر ہم خود داخل ہوئے۔ یہاں تک کے سارے مراحل سلطان احمد صاحب نے انجام دلائے۔ اس وجہ سے مجھے کسی ناگوار صورتِ حال سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ لیکن سلطان احمد صاحب کسٹم کے احاطہ کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے اب یہاں سے سارے حالات سے ہمیں خود عہدہ برا ہونا تھا۔ پہلے مرحلہ میں وہاں کے ہجوم اور شور و ہنگامہ کا میرے دماغ پر بہت برا اثر پڑا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ میری بیوی اس محشر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہیں۔ میں نے ان سے کہا، گھبراؤ نہیں۔ ہمیں آگے کے مراحل میں جگہ جگہ اس طرح کے حالات سے گزرنا ہے، اس وجہ سے اب گھبرانے کی بجائے صبر اور ہمت کے ساتھ ان چیزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو گئیں اور ابتدا اول اول مجھ پر جو پریشانی طاری ہوئی تھی وہ بھی دور ہو گئی۔

یہاں ہمیں اکٹھے تین چار کام کرنے تھے: کسٹم والوں سے اپنے سامان کا معائنہ کرانا تھا۔ پولیس والوں سے ہیلتھ پاس پر مہر لگوانی تھی۔ زرِ مبادلہ کے فارم پر بھی کچھ لکھوانا تھا اور سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اپنے ہیضہ اور چیچک کے ٹیکوں کا معائنہ کرانا تھا۔ اپنے اپنے اضلاع سے لے کر کراچی تک ہم ان ٹیکوں کا بار بار معائنہ کراتے پھرے لیکن ہمارے محافظینِ صحت اور ہمارے کار پردازانِ حج کو کسی طرح اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے فی الواقع یہ ٹیکے لگوائے بھی ہیں۔

کسٹم کے احاطہ کے اندر جمع شدہ ہجوم کی اکثریت کو نہ تو یہ پتہ تھا کہ یہاں ان کو کیا کیا کام کرنے ہیں اور نہ یہ پتہ تھا کہ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے ان کو کس ترتیب کے ساتھ کن کن مقامات سے گزرنا ہے۔ اس بے خبری کی وجہ سے عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پوچھتا پھرتا تھا، لیکن ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر بے خبر تھا۔ لاؤڈ سپیکر سے کچھ اعلانات وہاں بار بار ہو رہے تھے، لیکن ان اعلانات کا اس کے سوا مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہاں کے شور میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

ہر ایک کا سامان قلیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگرچہ ان قلیوں کی قمیصوں پر "مفت" کا لفظ بکثرت لکھا ہوا تھا لیکن یہ نہایت گراں بھی تھے اور نہایت بے رحم بھی۔ ہزار دقتوں کے بعد جب سامان کے معائنہ سے کسی طرح فرصت ملی تو پاسپورٹ اور ٹیکوں کے فارم چیک کرانے کی فکر ہوئی۔ خیریت تھی کہ یہاں عورتوں کے لیے الگ انتظام تھا۔ حاجی کیمپ کی طرح عورتوں اور مردوں، سب کو ایک ہی جگہ نہیں جمع کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کی رہنمائی کی اور وہ جلدی سے معائنہ کرا کے آگئیں۔ پھر مجھے اپنی فکر ہوئی لیکن میں نے

دیکھا کہ ایک نہایت لمبی قطار کھڑی ہے اور وہ شاید ۹ بجے صبح سے اسی حالتِ قیام میں ہے۔ کام اتنی سست رفتاری سے ہو رہا تھا کہ مجھے شام تک ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں اس قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا تو ذلّت اور تکلیف کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ اسی وجہ سے قطار میں کھڑے ہونے کی بجائے میں سب سے الگ ہو کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور اس بنچ سے اس وقت تک نہ اٹھا جب تک یہ سارا ہنگامہ ختم نہیں ہو گیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر صاحبان اور پولیس کے لوگ خود گھبرا چکے تھے اور کام نہایت تیزی سے ہونے لگا تھا۔ انھوں نے نہایت عجلت کے ساتھ ہمارے کاغذات پر کچھ نشانات لگائے اور ہم کو جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ملی۔

ہمارا سارا سامان اس دوران میں قلیوں کے رحم و کرم پر رہا۔ ہماری نشستیں چونکہ مخصوص تھیں اس وجہ سے ہمیں جگہ مل جانے کی توقع تھی اور یہ گمان بھی تھا کہ سامان بھی اپنی جگہ پر پہنچ گیا ہو گا لیکن جن بیچاروں کو ڈک پر کوئی جگہ حاصل کرنی تھی وہ جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی پریشان رہے اور اپنے اپنے سامانوں کی طرف سے بھی غیر مطمئن رہے۔ بخصوصیت کے ساتھ وہ لوگ نہایت پریشان ہوئے جو تنہا سفر کر رہے تھے اور جو نہ تو جہاز کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے اور نہ اتنی طاقت و ہمت ہی رکھتے تھے کہ سارے جہاز میں پھر کر اپنا سامان تلاش کر سکیں۔

ایک بوڑھے آدمی کا سارا سامان جہاز میں دو تین روز تک گم رہا۔ بالآخر ہمارے بعض رفیقوں نے اس کی مدد کی تو بڑی مشکلوں سے کہیں اس کا سامان دستیاب ہو سکا۔ یہی صورتِ حال نہ معلوم کتنوں کو پیش آئی ہو گی۔ اس صورتِ حال کے پیش آنے میں سب سے زیادہ دخل کسٹم، پولیس اور طبی معائنہ کے اس طریقۂ کار کو ہے جو پورٹ پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا اکثر حصّہ میرے نزدیک بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر اس کا کچھ حصّہ ضروری ہے بھی تو اس کو سادہ اور آسان بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کارپردازوں کے اندر خدمت کا جذبہ ہو اور مقصود حاجیوں کو تنگ کرنا نہ ہو۔

سردھانا جہاز کے عرشہ پر

اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد ہم سردھانا جہاز کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے۔ جہاز باہر سے نہایت شاندار اور صاف ستھرا نظر آیا۔ یہ خیال کر کے کہ اب میرے اور اس جہاز کے درمیان سرکاری رسوم و ضوابط کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے اور اب میں اس پر اپنے سب سے زیادہ محبوب و مطلوب سفر کے لیے سوار ہو سکتا ہوں، میرے دل کی خوشی کا جو حال ہوا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت میں اپنے رب کریم و کارساز کے لیے سراپا شکر و سپاس تھا۔ ابھی ہم جہاز کے نیچے ہی تھے کہ برادرم سلطان احمد صاحب

جو کسٹم کی نفسا نفسی میں ہم سے جدا ہو گئے تھے آ پہنچے۔ میں نے جہاز کے زینہ پر قدم رکھنا چاہا تو میری بیوی نے متنبہ کیا کہ پہلے دہنا پاؤں رکھوں۔ میں نے اس نصیحت پر عمل کیا اور خیریت و سلامتی، حسنِ نیت اور توفیقِ عمل کی دعائیں مانگتا ہوا زینہ پر قدم رکھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اللہ اکبر! اس سفر کی کیا شان ہے کہ اس کے سبب سے انگریزی کمپنی کا یہ جہاز بھی اتنا مقدس بن گیا ہے کہ ہم اس پر سوار ہوتے وقت پہلے دہنا پاؤں رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

جہاز کے عرشہ پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ہم نے اپنے کیبن میں پہنچ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ خدا کے فضل سے سارا سامان خیریت کے ساتھ اپنی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ برادرم سلطان احمد صاحب نے سامان کو قرینہ کے ساتھ ترتیب دیا اور کیبن کے تمام متعلقات اور تمام مضمرات سے ہمیں آگاہ کیا۔ ہم جہاز میں بالکل آخری وقت میں سوار ہوئے تھے اسی وجہ سے تھوڑی ہی دیر کے اندر اس نے روانگی کی سیٹی دے دی۔ اب برادرم سلطان احمد صاحب کو ہم سے رخصت ہو کر جہاز سے اترنا تھا۔ انھوں نے پہلے تو مجھ سے چند پاکیزہ مقاصد کے لیے دعا کی خواہش کی، پھر گلے ملے اور اس وقت جذباتِ محبت سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ میں بھی ان کی محبت کے سیلاب میں بہہ گیا۔ میں نے ان کو اور شاہدہ سلمہا کو مسنون دعا کے ساتھ رخصت کیا اور خود جہاز کے نئے ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو مانوس کرنے میں لگ گیا۔ یہ خیال نہیں ہوا کہ سلطان صاحب جہاز کے نیچے رخصت کرنے والوں کے ہجوم میں کھڑے رہیں گے۔ وہ صبح سے ہمارے ساتھ ہلکان ہوئے تھے، اس وجہ سے مجھے گمان ہوا کہ وہ فوراً گھر کو روانہ ہو جائیں گے، لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ جہاز کی روانگی تک برابر ہمیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے رہے۔ لیکن میں خود اپنے خیالات میں اس طرح ڈوب گیا کہ مجھے ساحل پر کھڑے رہنے والوں کا کچھ خیال نہیں رہا۔ درحقیقت میں اس سفر کو اپنی اہلیت اور اپنے استحقاق سے اس قدر برتر خیال کرتا تھا کہ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا تھا اور میں اس لذیذ خواب سے بیدار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب جہاز روانہ ہوا اور ہم نے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا پڑھتے ہوئے کراچی کو الوداع کہا تب مجھے یقین ہوا کہ اب میں سفرِ حج پر روانہ ہو گیا ہوں۔ حج کی درخواست کے بعد سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل نے سچے اطمینان کی ٹھنڈک محسوس کی۔ اب تک مجھے طرح طرح کے اندیشے ستاتے رہتے تھے کہ معلوم نہیں یہ لوگ میری راہ میں کس مرحلے میں کیا رکاوٹ ڈال دیں لیکن اب مجھے کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا، میں نے سوچا کہ اب زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہی تو کہ کہیں غرق ہو جائیں لیکن

اب تو جہاں بھی غرق ہو جائیں ہمارے لیے وہی ساحل ہے۔ اس خیال سے میرے دل کا وہ سارا بوجھ بالکل اتر گیا جو اب تک کسی طرح بھی اتر نہیں سکا تھا۔

سرور عالم جہاز نہایت صاف ستھرا جہاز ہے۔ حکومت پاکستان نے جو جہاز حاجیوں کے لیے دوسری کمپنیوں سے کرایہ پر حاصل کیے تھے ان میں سب سے بہتر جہاز یہی تھا اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حج کے کارپردازوں نے ہماری نشستیں اس جہاز میں مخصوص کیں۔ اس کے اوپر کے درجوں میں آسائش کے تمام لوازم موجود ہیں اور میرے جیسے شخص کے لیے تو یہ لوازم کمیت اور کیفیت دونوں ہی اعتبار سے ضرورت سے زیادہ تھے۔ اگر یہ جہاز پاکستان کا ہوتا تو میں اس کے کارپردازوں کو یہ مشورہ دیتا کہ وہ ان لوازم میں کمی کر کے کرایہ میں تخفیف کر دیں۔ کیونکہ فی الواقع یہ لوازم بھی زیادہ تھے اور کرایہ بھی بہت زیادہ تھا۔

میں نے دوران سفر میں جہاز کے نچلے حصوں کو بھی پھر کر دیکھا۔ ڈک کے مسافروں کو جو ناشتہ اور کھانا ملتا تھا اس کا اندازہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے صفائی اور کھانے کے لحاظ سے ڈک کا انتظام بھی قابل اطمینان پایا۔ البتہ یہ بات صاف محسوس ہوتی تھی کہ ڈک پر مسافر ڈک کی گنجائش سے زیادہ ہیں۔ ڈک کے بعض حصے نہایت تاریک تھے وہاں نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا۔ ایسی جگہوں پر آدمیوں کا بھر جانا تو درکنار، جانوروں کا بھرنا بھی کسی طرح جائز نہیں ہے۔ خود جہازی کمپنیوں کا فرض ہے کہ وہ ڈک کے ایسے حصوں کو مسافروں کے لیے استعمال نہ کریں لیکن ان کو اپنے کرایہ سے مطلب ہوتا ہے اور ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس جہاز نہیں ہیں۔ اس وجہ سے کوئی ہمارے حاجیوں کو جہاں بھی لادے اور جس طرح بھی لادے ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ بخصوص غریب حجاج کے معاملہ میں تو ہمارے کارفرما حضرات اتنے بے پروا ہیں کہ انھوں نے ان کی ضروریات کے مسئلہ پر انسان ہونے کے نقطۂ نظر سے شاید غور کرنا ہی سرے سے چھوڑ رکھا ہے۔

دوسرے دن سے جہاز کے عرشہ پر نماز باجماعت بھی ہونے لگی۔ اس کے اہتمام میں سب سے زیادہ حصہ تبلیغی جماعت کے بعض نوجوانوں کا تھا۔ انھوں نے جہاز کے عرشہ پر قدم رکھتے ہی اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ تبلیغی دورے بھی ہونے لگے اور نمازوں کے اوقات میں تقریریں بھی ہونے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تمام سرگرمیوں اور تقریروں میں علم سے زیادہ جذبہ کا حصہ تھا لیکن ان لوگوں کا جذبہ نہایت قابل قدر تھا۔ اس علم سے کیا فائدہ جس میں حرکت نہ ہو اور جس کے بوجھ کے نیچے فرض کا احساس دب کر رہ جائے۔ ان لوگوں نے تمام عازمین حج کو حج کے احکام و آداب سکھائے اور جہاز کے سفر کے دوران میں بہتوں کو ان باتوں سے واقف کر دیا جن سے وہ واقف نہ تھے۔

ان لوگوں کی ہمت کی داد دیجیے کہ انھوں نے مجھ جیسے غیر متحرک آدمی کو بھی حرکت میں لانے کی کوشش کی، اگرچہ میں ان کی سرگرمیوں میں عملاً تو کوئی حصہ نہ لے سکا لیکن مجھے ان سے اور ان کی خدمات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ غور کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اگر وہ اپنے طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی اور اپنے زاویۂ نگاہ میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لیں تو ان کے کام کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ میں نے ارادہ کیا کہ کبھی مولانا محمد منظور نعمانی اور علی میاں سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بعض ضروری امور کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ میں نے ان لوگوں سے خود براہ راست بات چیت کرنے کی ہمت اس وجہ سے نہیں کی کہ شاید میرے خیالات ان لوگوں کو اپیل نہ کریں۔

عازمین حج کے اس قافلہ کو دیکھ کر یہ بات بار بار میرے سامنے آئی کہ ہمارے ذہین طبقہ کے اندر حج جیسی عظیم عبادت کا احساس بمنزلہ صفر ہے۔ یہ پورا قافلہ تمام تر عوام پر مشتمل تھا۔ اس کے اندر اس طبقہ کا کوئی حصہ بھی شامل نہیں تھا جس کو ہم ذہین طبقہ کہتے ہیں اور جس کے اندر کام کرنے کے اور جس کو جگانے اور بیدار کرنے کے ہم مدعی ہیں۔ ہمارے جہاز میں کم و بیش ڈیڑھ ہزار عازمین حج تھے لیکن ان میں پانچ آدمی بھی ایسے نہیں تھے جن کو ذہین طبقہ کا نمائندہ کہا جا سکے۔ حج کی دینی اور دنیوی سے زیادہ سیاسی، اجتماعی اور ملی برکتوں پر بہت سے مقالے لکھے گئے ہیں اور ہم یہ گمان کر رہے تھے کہ ملک کے ذہین طبقہ میں بڑا عظیم انقلاب آگیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ انقلاب صرف انقلابِ عبادت کے نعرہ تک محدود رہا ہے۔ بندگانِ خدا کو حج کی طرف مائل کرنے میں اگر اس کا کوئی اثر ہے تو وہ معکوس ہے۔

جہاز پر ہمارے دن بڑے آرام سے گزرے، سمندر شروع سے آخر تک نہایت پرسکون رہا۔ کسی کسی وقت اگر تھوڑی بہت حرکت جہاز میں ہوئی بھی تو اس سے صرف وہ لوگ متاثر ہوئے جن کے لیے جہاز کا سفر بجائے خود ایک بیماری ہے۔ عام طور پر لوگ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے رہے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی میں نے ہشاش بشاش پایا۔ اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جہاز کے ماحول میں بڑی یکسوئی اور بڑی یگانگت تھی۔ سب کی منزل ایک اور سب کا مقصد ایک، جہاز کے باہر یہ لوگ کتنے گروہوں، کتنی جماعتوں اور کتنے فرقوں میں بٹے رہے ہوں گے اور ان کے اغراض و مقاصد اور ان کے افکار و نظریات میں کیا کیا اختلافات رہے ہوں گے لیکن جہاز کے اندر یہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی عشق میں سرشار نظر آتے تھے۔ میں جس ذہنی خلفشار کو پیچھے چھوڑ کر گیا تھا اس کا ہر اثر میرے دل سے اس مبارک ماحول نے دھو دیا۔ میں نے اطمینان کی یہ گھڑیاں اپنے ذہن اور دماغ کو حج کے لیے تیار کرنے میں صرف کیں۔ میں نے اس دوران میں حج کے مقاصد و اسرار پر غور بھی کافی کیا

اور جو چیزیں پڑھنے کے لیے ساتھ لے گیا تھا وہ چیزیں پڑھیں بھی۔ بحری سفر اگرچہ فضائی سفر کے مقابلے میں بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے چنانچہ میرے اس بحری سفر پر بعض دوستوں نے تعجب بھی کیا لیکن اس اعتبار سے یہ سفر بہت مفید معلوم ہوا کہ مجھے اس دوران میں اپنے ذہن اور اپنی طبیعت کو حج کے لیے تیار کرنے کا کافی موقع مل گیا۔ بعد میں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس سال سعودی حکومت نے ہوائی جہازوں سے پاکستان کے عازمین حج کو سفر کی اجازت ہی نہیں دی تو بحری سفر کے معاملے میں مجھے اپنا یہ فیصلہ "تائید غیبی" کا مظہر معلوم ہوا اور میں نے اس پر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

احرام ابھی مشاغل کے اندر ہم اپنی میقات یعنی یلملم کے قریب پہنچ گئے اور جہاز کے کارپردازوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ رات کے آٹھ بجے ہم یلملم کے سامنے سے گزریں گے۔ عازمین حج احرام کی تیاریاں کر لیں۔ یہ اعلان سن کر میرا دل دھڑکنے لگ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا کوئی بہت ہی اہم موڑ سامنے آنے والا ہے۔ اس سے پہلے میرے دل میں بارہا یہ شوق پیدا ہوا تھا کہ کاش کبھی وہ دن آئے کہ میں احرام باندھے ہوئے لبیک لبیک کہتا ہوا جدہ کے ساحل پر اتروں۔ احرام میں حنیفیت اور یکسوئی کی جو شان ہے، سب سے کٹ کر ہجرت الی اللہ کی جو کیفیت ہے، زینت اور زندگی کی لذتوں سے منہ موڑ کر فنا فی اللہ ہونے کی جو ادا ہے اور اسلام میں رہبانیت نہ ہونے کے باوجود، احرام میں تبتل، ترک دنیا اور فقر و درویشی کا جو جمال ہے، علاوہ ازیں تلبیہ کے پاکیزہ کلمات میں جو جذبہ، جو ولولہ، جو فدویت اور جو جوش و سرمستی ہے ان ساری چیزوں کا تصور میں اس سے پہلے بارہا کر چکا تھا اور حج کے زمانوں میں وارفتگی کی یہ صورت و ہیئت اپنے اوپر بھی طاری کرنے کی آرزوئیں میرے دل میں بارہا پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ مبارک وقت آیا کہ میں احرام باندھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل ایک بہت بھاری بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ یہ بوجھ احرام کی پابندیوں کے احساس کا بوجھ ہرگز نہیں تھا۔ احرام میں پابندیاں ضرور ہیں لیکن یہ اس دین فطرت کا کمال ہے کہ اس نے اپنی عبادات میں ترک دنیا اور درویشی کی قسم کی کوئی چیز شامل بھی کی ہے تو وہ صرف اس حد تک ہے کہ وہ نفس کو خدا کی طرف موڑ تو سکے لیکن اس کو توڑ نہ سکے۔ اس وجہ سے میرے جیسے طالب العلم مزاج آدمی کو احرام کی ظاہری پابندیوں سے کیا گھبراہٹ ہو سکتی تھی؟ میرے لیے پریشانی کی چیز یہ سوال تھا کہ احرام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ محض ظاہر کے لباس کو تبدیل کر لینے کا نام ہے یا یہ کسی باطنی تبدیلی کو بھی مستلزم ہے۔ مجھے یہ بات صاف نظر آئی کہ یہ ظاہر کی تبدیلی محض ایک نشان ہے۔ اس کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ آدمی کا باطن بھی تبدیل ہو جائے اور

تلبیہ کے جو الفاظ زبان پر ہیں ان کی روح سے انسان کا دل سرشار ہو جائے۔

اس تبدیلی کی خواہش تو بہت پہلے سے میرے دل میں موجود تھی لیکن جب فی الواقع اس تبدیلی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ایک چیز کی خواہش کرنے اور اس کے کر گزرنے میں بڑا فرق ہے۔ خواہش اور عمل میں جو فاصلہ ہے وہ اس موقع پر مجھے نمایاں طور پر محسوس ہوا۔ مجنوں کی وارفتگیوں کی داستان سن سن کر اس پر واہ واہ کہنا اور چیز ہے اور خود مجنوں بن کر صحرا کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑے ہونا اور چیز ہے۔ میں نے اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے رب! تو مجھے اس تبدیلی کی ہمت دے، میں جس وقت اپنا پرانا لباس اتار کر تیرا پسندیدہ لباس پہنوں تو اسی کے ساتھ میرے دل پر چڑھا ہوا گناہوں کا غلاف بھی اتر جائے اور میرے ظاہر کی طرح میرے باطن کو بھی لباس تقویٰ کی زینت نصیب ہو۔

اسی ذکر و فکر میں عصر کا وقت آ گیا۔ اگرچہ یلملم کی پہاڑی ابھی دور تھی لیکن میں نے غسل کر کے جماعت کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد احرام باندھ لیا۔ اس وقت میرے دل پر خوشی اور اضطراب کی دوگونہ کیفیات طاری تھیں۔ خوشی اس بات کی تھی کہ جس حج کی آرزو دل میں مدتوں سے پرورش پا رہی تھی، اس کی منزلوں میں سے پہلی منزل میں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اضطراب اس بات کے سبب سے تھا کہ مبادا اس جامۂ احرام کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ احرام باندھتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میری اہلیہ نے اس موقع پر رو رو کر میرے لیے اور اپنے لیے دعائیں کیں۔

شام تک جہاز کے مسافروں کی اکثریت احرام کے لباس میں نظر آنے لگی اور مقصد کی یکسانی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لباس میں بھی یکسانی پیدا ہو گئی۔ صرف جہاز کے ملازمین اور وہ تھوڑے سے لوگ اس سے مستثنیٰ تھے جو جدہ سے سیدھے مدینہ منورہ کا قصد رکھتے تھے۔ جہاز کے گوشہ گوشہ سے تلبیہ کی صدائیں بھی بلند ہونے لگیں۔ خصوصاً نمازوں کے بعد تو یہ شور اتنا وجد انگیز ہوتا کہ میں سردست جہاز کی ہر چیز بھول سکتا ہوں لیکن اس چیز کو میرا حافظہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

معمولاً میں عشا کی نماز کے بعد سو جانے کا عادی ہوں لیکن اس رات میں اس وقت تک جاگتا رہا جب تک جہاز کے یلملم سے آگے نکل جانے کا گمان نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے سونے کی کوشش کی لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ خیال ذہن پر غالب رہا کہ صبح جہاز جدہ پہنچنے والا ہے اور ہم سرزمین حجاز پر قدم رکھنے والے ہیں۔

بقیہ تفسیر سورۂ بقرہ

کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ ابن زید کا قول یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص دین کے پیرو تھے اور جزیرہ موصل میں آباد تھے، ان کا عقیدہ توحید تھا لیکن نہ تو یہ کسی نبی اور کسی کتاب کے پیرو تھے اور نہ ان کے ہاں شرعی اعمال کا کوئی مخصوص نظام تھا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے، قبلہ کی طرف نماز پڑھتے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابوالعالیہ اور سفیان کے نزدیک یہ لوگ اہل کتاب میں سے ایک فرقہ تھے۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اقوال بظاہر متضاد نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اول اول یہ لوگ دین حق پر تھے لیکن بعد میں یہ لوگ دین حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح حضرت اسماعیلؑ کی اولاد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھی لیکن بعد میں شرک بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ قرآن مجید کی زیر بحث آیت سے مولانا رح کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ قرآن نے اس گروہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اس سے یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ یہ لوگ ابتداءً دین حق پر تھے، بعد میں بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہوئے۔ مولانا رح کا قیاس یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر نماز کی عبادت معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ تھی چنانچہ اسی اشتراک کے سبب سے مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صابئین کہتے تھے۔

ان کی وجہ تسمیہ سے متعلق مولانا رح کا خیال یہ ہے کہ چونکہ صباء کے معنی طلوع ہونے کے آتے ہیں اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی ستارہ شناسی اور معرفت نجوم میں مہارت کے سبب سے اس نام سے موسوم ہوئے ہوں۔

چونکہ اس مذہب کے پیرووں کا وجود اب کہیں باقی نہیں رہا ہے اور نہ ان کی کوئی مستند تاریخ ہی موجود ہے اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفصیل کے لیے مفردات القرآن مولانا فراہیؒ

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

— اسلامی اخبارات میں عریاں تصاویر کی اشاعت
— موجودہ حالات میں علماء کی بے حسی،

سوال: ایک دو چیزیں میرے ذہن میں کافی دیر سے کھٹک رہی ہیں براہ مہربانی ان کے جوابات میثاق میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(۱) کیا عریاں تصاویر، چاہے وہ سینما کی صورت میں ہوں یا اخبارات میں اشتہار کی صورت میں ہوں، ان کی اشاعت جائز ہے۔ بعض دعوت اسلامی کے دعوے دار حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس مسئلے میں علمائے کرام کا آپس میں اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب کے علماء تو اس کو جائز قرار دیتے ہیں اگر پاکستان کے کچھ علمائے کرام اس کو حرام کہتے ہیں تو یہ ان کی زیادتی ہے۔ واضح رہے کہ بعض اشتہارات ایسے ہوتے ہیں جن پر عورت کی نمایاں تصویر ہوتی ہے اور بعض پر صرف چہرہ اور سر ہی ہوتا ہے اور یہ تصویریں صرف دو مقصدوں سے دی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قارئین خوش ہوں دوسرے یہ کہ اخبار کو خسارے سے بچایا جائے۔

(۲) پاکستان میں جس تیزی کے ساتھ برائی اور بے حیائی کا سیلاب آرہا ہے اس کے تدارک کے لیے کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ ہمارے علمائے کرام تو اس طرح خاموش ہیں کہ جیسے ان پر کوئی فرض ہی عائد نہیں ہوتا۔ اس مملکت میں پرویزی ہیں، قادیانی ہیں، ایک نیا گروہ بھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے وہ بہائی ہیں۔ اور پھر عیسائی مشنریاں ہیں یہ سب فتنے ایک ایسے ملک میں ہیں جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ کیا اس سلسلے میں علمائے کرام کی یہ خاموشی خدا کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔

جواب: تصویروں سے متعلق جہاں تک شریعت کے احکام کا تعلق ہے ان کا علم جس حد تک ہم کو ہے اس سے زیادہ ان کا علم خود ان حضرات کو ہے جو آج ان کو عملاً اور قولاً جائز قرار دیے بیٹھے ہیں۔ ان حضرات نے خود بڑے شد و مد کے ساتھ ان کی حرمت کے فتوے رقم فرمائے ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت وسیع پیمانہ پر ان کی اشاعت کی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس علم و خبر کے باوجود ہوا ہے کہ مصر اور شام کے علماء کا مسلک اس بارے میں کیا ہے۔ اس عرصہ میں نہ تو شریعت کے احکام میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہے اور نہ مصر و شام کے علماء نے اپنی کوئی نئی تحقیق پیش کردی ہے کہ جو چیز کل تک حرام تھی آج وہ جائز قرار پا جائے۔ آج اگر یہ چیز جائز قرار دے دی گئی ہے تو حکمت عملی اور اختیار اھون البلیتین کے انہی اصولوں کے تحت جائز قرار دی گئی ہے جن کی تردید میں میثاق کے صفحات میں نہایت مفصل مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ ان تصویروں کے جواز کے حق میں ان حضرات کی اصل دلیل یہ ہے کہ اقامت دین کے مقصد کے لیے اس زمانہ میں اخبارات ناگزیر شے ہیں اور اخبارات کی کامیابی اشتہارات کے بغیر اور اشتہارات کی کامیابی تصاویر (خصوصاً عورتوں کی تصاویر) کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگرچہ تصاویر کی اشاعت اسلام میں ممنوع ہے لیکن چونکہ اس کے بغیر اقامت دین کی ساری تحریک ہی بیٹھی جاتی ہے اس وجہ سے ایک بڑے شر سے بچنے کے لیے اس چھوٹے شر کو گوارا کرلیا گیا ہے کہ حکمت عملی کے اصول کا تقاضا یہی ہے۔

جن لوگوں نے حکمت عملی اور اختیار اھون البلیتین کے اس فلسفہ کو قبول کرلیا ہے انھیں اس فلسفہ کے اس فطری اور منطقی نتیجہ کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ ہر اصول اپنے لوازم و نتائج کا ایک کنبہ رکھتا ہے۔ جب وہ اصول آئے گا تو ظاہر ہے کہ تنہا نہیں آئے گا بلکہ اپنے پورے کنبہ کے ساتھ آئے گا۔ چنانچہ اس اصول کے تحت صرف تصویروں کی اشاعت ہی جائز نہیں قرار پائی ہے بلکہ جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ اپنے مضامین میں بیان کر چکے ہیں شریعت کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہر چیز جائز قرار پا سکتی ہے، اور آپ دیکھیں گے کہ اگر اس اصول کو فروغ ہوا تو اس سے شریعت کے کتنے حرام خود شریعت کے نام پر جائز قرار پا جاتے ہیں۔

تصاویر سے متعلق جہاں تک علمائے مصر و شام کے رویہ کا تعلق ہے وہ کسی دلیل شرعی پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر شکست خوردگی پر مبنی ہے۔ مغربی تہذیب کے غلبہ نے انھیں اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ پردہ

اور تصاویر وغیرہ سے متعلق وہی نقطہ نظر اختیار کرلیں جو ملک کے عوام اور اہل سیاست کا بن چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس معاملہ میں اخوان نے بھی کوئی ہمت نہیں دکھائی۔ ہمارے نزدیک شکست خوردگی کی یہ آخری حد ہے۔

۲۔ موجودہ فتنوں کے مقابل میں علماء کی بے حسی کا جو آپ نے ذکر فرمایا ہے تو اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ان حضرات کی یہ خاموشی قابل صد افسوس ہے لیکن ان کی بعض مجبوریاں بھی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ ہمارے ملک میں دو قسم کے علماء ہیں۔ ایک وہ جو ہمیشہ سے اجتماعی امور سے بالکل الگ تھلگ ہو کر صرف درس و تدریس اور مسجد و خانقاہ سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے نہ کبھی پہلے اپنے مخصوص دائرہ سے قدم باہر نکالا ہے۔ نہ اب یا آئندہ ان سے توقع ہے کہ وہ اس دائرہ سے باہر قدم نکالیں گے۔ ہمارے نزدیک اس گروہ سے اس بات کے لیے شکوہ سنج ہونا کہ وہ ان فتنوں کے مقابلہ کے لیے کیوں نہیں اٹھتا ایک بالکل غیر مفید سی بات ہے۔

دوسری قسم ان علماء کی ہے جو سیاسی اور اجتماعی معاملات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس گروہ کا طرۂ امتیاز ہی یہ رہا ہے کہ اس نے دین کو صرف مسجد اور خانقاہ تک ہی محدود نہیں سمجھا بلکہ اس کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کرنے کی کوشش کی۔ اس گروہ سے البتہ شکایت ہونی چاہیے کہ اس نے اپنے اس نصب العین کو بالکل فراموش کردیا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ گروہ بھی بالکل مجبور و معذور ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ اس نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ اہل سیاست کا وہی مکروہ طریقہ تھا جس طریقہ پر کام کرنے کی آج ساری راہیں بالکل مسدود ہو چکی ہیں۔ اس طریقہ کے سوا ان حضرات کو یا تو کسی اور طریقہ کا علم ہی نہیں ہے، یا علم ہے لیکن اس پر چلنے اور چلانے کی ہمت ان کے اندر نہیں ہے۔ اگر ان حضرات کو انبیاء کے طریقہ کا علم ہوتا اور وہ اس پر چلنے کی ہمت بھی رکھتے تو ان کو یہ افتاد کبھی نہ پیش آتی جس نے ان کو بالکل دست و پا شکستہ بنا کر ڈال دیا ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے جس پر چلنے کی ہم ان حضرات کو دعوت دے رہے ہیں لیکن جن لوگوں کو سیاسی جوڑ توڑ اور حصول اقتدار کا چسکا پڑ جاتا ہے اور جنھیں جوشیلی اور ہنگامی تقریروں کی چاٹ لگ جاتی ہے وہ ان ہتھیاروں سے دست بردار ہو کر انبیاء کے روکھے پھیکے طریقہ پر کیوں آنے لگے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ ان حضرات پر ان کے موقف اور طریقہ کار کی غلطی واضح ہو جائے اور یہ کام کرنے کے اس راستہ پر آ جائیں جو انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے اور جس پر چلنے والے کبھی ناکام و نامراد نہیں ہوتے۔

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبر قرآن

تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ

اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کے لیے دیجیے تاکہ قرآن مجید کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو۔

تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۳۶ ہدیہ ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک

☆ محصول ڈاک رجسٹری ۶ بک پوسٹ ۱

ملنے کا پتہ

مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۸۔ احمد سٹریٹ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا